زادِ عمل ۳

نئے مسائل
اسلامی نقطۂ نظر

جس میں موجودہ دور میں پیش آنے والے جدید وقدیم مسائل پر دعوتی وتذکیری اسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فہرست مضامین

پیش لفظ

اس حقیر کے مضامین کا مجموعہ "راہِ عمل" کا یہ تیسرا حصہ ہے، اس حصہ میں زیادہ تر موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، خواہ وہ نئی ایجادات کا نتیجہ ہوں، یا سماجی اور معاشی اقدار میں تبدیلیوں کا، ان میں بعض وہ مسائل بھی آگئے ہیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے جدید نہیں ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں، جیسے قنوت نازلہ اور نماز استسقاء وغیرہ، چوں کہ ان کی نوبت گاہے گاہے پیش آتی ہے، اس لئے لوگوں کو ان سے متعلق شرعی احکام واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قارئین کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ مضامین اخبارات کے لئے لکھے گئے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگ استفادہ کریں، اس لئے ان تحریروں میں علم و تحقیق اور طویل عربی عبارتوں کے بجائے دعوتی اور تذکیری اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اور عربی عبارتوں سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اس بات کی بھی سعی کی گئی ہے کہ مسائل کو خشک قانونی زبان میں بیان کرنے کے بجائے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بھی واضح کیا جائے، تاکہ دل کے ساتھ دماغ بھی اسے قبول کرنے کو تیار ہو۔

اس مجموعہ کی ترتیب کے سلسلہ میں عزیزی گرامی قدر مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی زادہ اللہ علما نافعاً وعملاً صالحاً متقبولاً کا مجھے بھی شکر گذار ہونا چاہئے اور قارئین کو بھی، کہ انہوں نے ایک تو مختلف جگہوں سے ان مضامین کو اکٹھا کرنے کی زحمت اٹھائی اور نہایت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ اسے مرتب کیا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں زیادہ سے زیادہ دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق میسر فرمائے، اور یہ مجموعہ اس حقیر کے لئے بھی اور عزیز گرامی کے لئے بھی دنیا و آخرت میں فلاح کا باعث بنے۔ آمین۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرض مرتب

مذہب اسلام کی اگر چند امتیازی خصوصیات کو شمار کیا جائے تو ان میں اس کی فطرت انسانی سے ہم آہنگی اور ہر دور اور زمانہ میں انسانیت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے معمور ہونے کی خصوصیت سرفہرست ہوگی، چنانچہ انسانی تاریخ کی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام نے جس طرح آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ دنیا تمدنی ترقی کے اعتبار سے ابتدائی مرحلہ میں تھی، لوگوں کے مسائل کو حل کیا اور انہیں شاہراہ زندگی پر چلنے کا سلیقہ سکھایا، اسی طرح آج جب کہ دنیا صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں اپنی معلوم تاریخ میں ترقی کی آخری انتہاء کو پہونچ رہی ہے، اسلام اسی طرح انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اسلام نے اپنے بنیادی عقائد و احکام میں جن چیزوں کا حکم دیا ہے شریعت کے تفصیلی احکام انہیں بنیادی اصول اور ہدایات کی تطبیق سے عبارت ہیں۔ کیوں کہ قانون کی پاسداری انسانی فطرت اور اس کا امتیاز ہے اور یہی انسانوں اور جانوروں کے درمیان امتیاز کا ایک بنیادی اور اہم پہلو ہے، چنانچہ جن لوگوں نے اس فطری مذہب اور خدائی قانون کو قبول کرنے سے انکار کیا، اللہ کی کتاب انہیں "جانور بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ" (اولئک کالانعام بل ھم اضل) سے تعبیر کرتی ہے کہ جانوروں کو کسی قانون یا طرز حیات کی ضرورت نہیں۔

اسلام کے دو بنیادی سرچشمے کتاب اللہ (قرآن مجید)، سنت نبوی (حدیث) میں ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسائل کے بارے میں شرعی حکم کی صراحت نہیں ملتی اور یہی عین قرین مصلحت ہے۔ کیوں کہ زمانہ اور حالات کے لحاظ سے قانون کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان میں ایسے اصول و قواعد ضرور بیان کر دیے گئے ہیں، جن کی

روشنی میں صبح قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور علماء ــــ جنہیں انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے ــــ کی ذمہ داری ہے کہ شریعت کے رہنمایانہ اصول وقواعد اور مزاج و مذاق کی روشنی میں جدید مسائل کا حل نکالیں، نئے مسائل کا حل تلاش کرنے والے علماء کے لئے بیک وقت جہاں نصوص شرعیہ پر گہری نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، وہیں فقہاء کی بیان کردہ جزئیات کے ساتھ ساتھ ان کے مستنبط کردہ اصول و قواعد سے مکمل آشنائی بھی اسی قدر اہمیت رکھتی ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی نظر اپنے عہد کے حالات اور رواجوں پر بھی ہو۔ مؤلف کتاب حضرت مولانا ہمیشہ ہم لوگوں سے تاکید کرتے کہ فقہاء کی جزئیات تو اپنے حالات وزمانہ کے تابع ہوتی ہیں، آپ کی نظر اصول وقواعد پر ہونی چاہئے، جن پر حالات وزمانہ کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔ مولانا مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے فقہ اسلامی میں جو نہایت اعلیٰ مقام عطا کیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، فکر رسا، ذہن اخاذ اور فکری اعتدال کی صفت سے اللہ نے آپ کو خاص طور پر نوازا ہے، جو اس فن کے حاملین کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہیں، چنانچہ فقہ اسلامی سے متعلق آپ کی تحریریں جہاں علماء کے لئے سامان آسودگی فراہم کرتی ہیں، وہیں عوام بھی زبان وتعبیر کے سہل و عام فہم ہونے کی وجہ سے اس سے اسی قدر استفادہ کرتے ہیں، جدید فقہی مسائل (پانچ حصے) قاموس الفقہ (پانچ جلدیں)، اسلام کا نظام عشر وزکوۃ، آپ کی وہ تصنیفات ہیں، جو یقیناً فقہ اسلامی کی لائبریری میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں اور بہت ہی مختصر مدت میں برصغیر کے افق پر مہر تاباں بن کر چھا گئی ہیں۔

پچھلے چھ سالوں سے ہندوستان کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن مینارۂ نور میں شمع فروزاں کا کالم آپ کے قلم گہر بار سے مزین ہوتا آ رہا ہے۔ جس میں کبھی سماجی مسائل کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے، تو کبھی قارئین کو حالات کے پس منظر میں صحیح سمت رہنمائی کی جاتی ہے، اور کبھی آپ اپنے نظری فقہی

ذوق کی مناسبت سے نئے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں، فقہی مضامین اس لحاظ سے بھی اسلامی قلمکاروں کے لئے نمونہ ہیں کہ علم و تحقیق کی رعایت کے ساتھ سہل اور بہتر اسلوب تحریر اختیار کیا جائے کہ جس سے عوام و خواص دونوں کو استفادہ میں سہولت ہو۔

یہ کتاب جو ابھی آپ کے ہاتھوں میں ہے ان کے فقہی مضامین کا گلدستہ ہے، جس کے غنچہ و گل "منصف" کی سرزمین پر تھے، راقم الحروف نے ان بکھرے ہوئے پھولوں کو مختلف الماریوں سے جا کر منصف کی قدیم فائلوں سے اکٹھا کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس درمیان احقر خود بھی ان گلہائے سدا بہار کی خوشبو سے معطر ہوا اور شاد کام ہوا ہے، یقیناً راقم اپنے لئے اس کو فخر و سعادت کا باعث سمجھتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کا سایہ تادیر قائم رکھے، اور یہ کتاب خدا کی بارگاہ میں قبولیت سے نوازی جائے اس کا فیض عام سے عام ہو، اور مصنف کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذریعہ نجات بنے۔ آمین۔

محمد نعمت اللہ قاسمی

(ارکان معہد)

بنیادی انسانی حقوق کا اولین منشور

بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خون آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو جنگ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرق بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے، چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اٹھی تو زندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی اور دوسرے مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے یہ آواز اٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ و امن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو۔ بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی پس منظر میں ۱۰ دسمبر کو عالمی سطح پر "بنیادی انسانی حقوق" کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ہر چند کہ یہ منشور عملاً ایک خط سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور رد کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں۔ دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے، لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی کامیابی ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس میں جو کچھ خامیاں ہیں وہ بتدریج دور ہو سکیں گی۔

یہ منشور تیس دفعات پر مشتمل ہے، جس میں زندگی کا حق، آزادی اور وقار، حقوق کے معاملہ میں مساوات، نسل و رنگ، جنس، زبان اور مذہب کی بنا پر عدم تفریق، قانونی مساوات، عدالتی چارہ جوئی کا حق دیا گیا، گرفتاری یا جلاوطنی کی ممانعت، الزامات سے مقابلہ صفائی کا حق، نجی زندگی کے تحفظ کا حق، ملک کی حدود میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی، بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے، شہریت حاصل کرنے، اپنی مرضی سے شادی کرنے، تنہا یا مشترک جائداد رکھنے، ضمیر و عقیدہ، و تبدیلی مذہب، اظہار خیال اور اجتماع و تنظیم، اپنے ملک کی سیاست میں حصہ داری، اپنی پسند کے پیشہ کا انتخاب، حصول تعلیم وغیرہ کے حقوق کا ذکر ہے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خواتین اور بچوں کے حقوق، نیز نسلی امتیاز اور غلامی کے انسداد کے لئے بھی اقوام متحدہ نے مختلف قرار دادیں منظور کی ہیں، جو گویا اسی منشور کا تکملہ ہیں۔

اگر واقعی دیانت داری کے ساتھ اس منشور کا نفاذ عمل میں آتا تو یہ انسانیت کے لئے باران رحمت ثابت ہوتا، لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہیں پایا، ایک تو یہ تحریک ہی ریاکارانہ ہے، دوسرے مختلف ملکوں نے انسانی حقوق کے الگ الگ پیمانے قائم کر لئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی بے بسی کا کھلا ہوا ثبوت ماضی قریب میں یورپ کے قلب "بوسنیا" میں ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسلی امتیاز کو قابل سرزنش جرم قرار دینے کی غرض سے ایک تجویز پاس کی تو امریکہ اور برطانیہ بھی اس تجویز کے مخالفین میں تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود قانون بنانے والوں کی نگاہ میں ان حقوق کی کیا اہمیت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو دبانے، دھمکانے اور ان کا استحصال کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔

مسلمانوں کی تصویر آج کچھ اس طرح مسخ کردی گئی ہے کہ لوگ "مسلمان" اور "دہشت گرد" کو مترادف الفاظ تصور کرنے لگے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اسلام میں انسانی قدروں کے احترام کا کوئی تصور نہیں ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علم و دانش کی موجودہ

دنیا کو انسانی حقوق کا سب سے پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا اور آج دنیا میں جو کچھ انسانی حقوق کی بات کی جارہی ہے، وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کے تصور کی بازگشت ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا، وہ بنیادی انسانی حقوق کے لئے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ اس خطبہ کے چند اقتباسات کچھ اس طرح ہیں:

○ لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا فضیلت نہیں۔ ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام دعوے اور مفاخر ختم کئے جاتے ہیں بجز سدانہ (کعبہ کی نگرانی و نگہبانی) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کے عہدے باقی رہیں گے۔

○ قتل عمد کا بدلہ قصاص ہے، عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے واقع میں آئے، اس کی دیت سو اونٹ مقرر ہے، جو زیادہ چاہے گا وہ اہل جاہلیت میں سے ہوگا۔ اہل قریش! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دنیا کا بوجھ لدا ہوا ہو، جب کہ دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اہل قریش! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو خاک میں ملادیا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے لئے تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

○ لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تمہارے لئے حرام (محترم) ہیں، یہاں تک کہ قیامت میں خدا کے سامنے پیش ہو، جس طرح اس دن اور اس مہینے کی حرمت تمہاری نزدیک مسلم ہے، اور عنقریب تم سب خدا کے آگے جاؤ گے، پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس فرمائے گا۔

○ تمام سودی کاروبار آج سے ممنوع قرار پاتا ہے، البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا۔ اللہ نے یہ بات طے کردی ہے کہ سود کی گنجائش نہیں اور جہاں تک عباس (ابن عبدالمطلب) کے سود کا تعلق ہے تو میں اس

تمام سود کو باطل کرتا ہوں، اور زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں اور (اپنے خاندان میں سے) پہلا انتقام جسے میں معاف کرتا ہوں، ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بچے کا، جسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔

○ قرض قابل ادائیگی ہے، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہئے، تحفہ کا بدلہ دینا چاہئے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے تو اسے تاوان ادا کرنا چاہئے۔

○ لوگو! تمہارے اوپر جس طرح تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اسی طرح ان پر تمہارے کچھ حقوق واجب ہیں، عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ سلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی بے حیائی کا کام نہ کریں، پس اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو اور انہیں مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (حسب حیثیت) ان کا کھانا، کپڑا تمہارے ذمہ ہے، پس عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور ان سے بہتر سلوک کرو، کیوں کہ وہ تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں، تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال ہوئی، اور کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

○ لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کچھ لے سوائے اس کے جو اس کا بھائی برضا و رغبت عطا کر دے، اپنے نفس اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔

○ اور ہاں تمہارے غلام! ان کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ اسی میں سے ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو اللہ کے بندو! انہیں فروخت کر دو اور انہیں سزا نہ دو۔

○ لوگو! سنو اور اطاعت کرو، اگر چہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنا دیا جائے، جو تم پر کتاب اللہ کو قائم کرے۔

غور کیا جائے تو آپ ﷺ کا یہ خطبہ بنیادی انسانی حقوق کا اصل منشور ہے، جس

میں انسانی مساوات، جرم و سزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال و جائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان و اظہار ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو محض کاغذی دستاویز نہیں بنایا، بلکہ اس کو برت کر دکھایا، کمزوروں کی دادرسی کی اور پست کو بلند کیا۔ قرآن و حدیث میں اور پھر قرآن و حدیث سے اخذ کر کے کتب فقہ میں انسانی بنیادی حقوق کو اتنی وضاحت و تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے اور ان کو سامنے رکھ کر ایک پورا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے کہ شاید کہیں اور اس کی مثال مل سکے۔ اسلام نے حقوق کو صرف دنیا ہی سے متعلق نہیں رکھا، بلکہ ان حقوق کی ادائیگی اور عدم ادائیگی سے آخرت کے احتساب کے تصور کو بھی وابستہ رکھا، یہ تصور انسان کو ان حقوق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اگر دنیا کو واقعی انسانی حقوق کی پاسداری مطلوب ہے تو اسے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ اسلام کسی ایک قوم کی میراث نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی امانت ہے۔

(۱۰؍ دسمبر ۱۹۹۸ء)

بین قومی اتحاد —— اسلام کی نظر میں

دنیا میں دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، اس جنگ نے پوری دنیا کی کمر توڑ دی، مفتوحین تو کیا فاتحین کے بھی ہوش ٹھکانے لگ گئے، تہذیب نے اتنی بے قصور جانیں جنگ کے اس مہیب دوزخ آشام مغربیت کی نذر ہو گئیں، نازیوں کی یہود دشمنی میں کتنے یہودی کام آئے؟ اس کی صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے، البتہ ساٹھ لاکھ سے زیادہ تو وہ یہودی تھے جن کو گیس چیمبروں میں ڈال کر ختم کر دیا گیا، یہ گویا ایک پوری قوم اور نسل کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی شیطانی سازش تھی، ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اب تک کی تاریخ میں اور آخری بار ایٹم بم گرایا گیا، اس سے ہونے والی تباہ کاری یہودیوں کی نسل کشی سے بھی آگے بڑھ گئی اور افسوس کہ یورپ نے اس واقعہ پر افسوس کرنے کی بجائے جشن منائے اور خوشیاں منائیں، آخر اگست ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ اختتام کو پہونچی، اس سے پہلے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰ ملک کے نمائندوں نے بین الاقوامی امن اور صلح کی غرض سے سان فرانسسکو میں ایک اجتماع منعقد کیا تھا، اب چار ماہ بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اگلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اقوام متحدہ کے منشور پر پچاس ممالک نے دستخط کئے، اور اس طرح ادارہ "اقوام متحدہ" کا وجود عمل میں آیا، اقوام متحدہ اس نوعیت کا پہلا ادارہ نہیں تھا، بلکہ اس سے پہلے ۱۹۱۹ء میں صدر امریکہ مسٹر ولسن کی تحریک پر لیگ آف نیشنس (مجلس اقوام) قائم ہو چکی تھی، جس میں دنیا کے پچیس ممالک شامل تھے، لیکن دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے عملاً اس تنظیم کا خاتمہ ہو گیا، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے اس کی جگہ لی، اب اس وقت اقوام متحدہ کی رکن ممالک کی تعداد ایک سو پچاسی ۱۸۵ تک پہونچ چکی ہے، گو عملاً یہ عالمی تنظیم محض پانچ ممالک، امریکہ، برطانیہ، چین، روس اور

قرآن کی ترجمانی ہے۔ لیکن بہر حال عالمی سطح پر انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے ادارہ کا وجود ایک ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر انصاف کا حصول، تمام ملکوں کو قانون جنگ کا پابند رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ اور متصادم اقوام و ممالک کے درمیان صلح و صفائی کی کوشش، نیز انسانی بنیادوں پر مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا ہے۔ گو یہ بتانا مشکل ہے کہ اقوام متحدہ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اور کیا طاقت ور ممالک کو بھی عدل و انصاف کا پابند بنانے میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہایت اہم اور اعلیٰ مقاصد ہیں، اور موجودہ حالات میں جب کہ پوری دنیا ایک گھر بن چکی ہے، بہ مقابلہ پہلے کے اس کی اہمیت کہیں بڑھ گئی ہے، اس پس منظر میں ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسی بین اقوامی وحدت کی کیا اہمیت ہے؟ اور اسلام اس سلسلہ میں کیا تصور رکھتا ہے؟۔

امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کی فراہمی اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کی جس آیت میں عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے، اسی کو خطبہ جمعہ کا جز بنا دیا گیا اور ہر جمعہ کو یہ آیت پڑھی جاتی ہے، ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان۔ (النحل: ۹۰) قرآن مجید ہمیں تلقین کرتا ہے کہ کسی کی عداوت و دشمنی بھی تمہاری طرف سے عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ پائے، ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ألا تعدلوا (المائدہ: ۸) اس لئے قیام امن کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ اور مطلوب ہوگی۔ قرآن نے اپنے آپ پر یقین کرنے اور اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے والوں کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں، مومن اور مسلم، "مومن" "امن" سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی ہیں دوسرے کو امن دینے والے کے، اور "مسلم" "سلم" سے ہے، جس کے معنی صلح اور بچاؤ کے ہیں، گویا "مسلم" وہ ہے جس سے دوسرے لوگ عافیت و سلامتی میں رہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں امن و امان اور صلح و آشتی کی کیا

اہمیت ہے!

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کوشش نبوت سے پہلے ہوئی، جس کو "حلف الفضول" کہتے ہیں، اس تحریک میں آپ پیش پیش رہے، ہوا یوں کہ بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے، ان سے عاص بن وائل نامی شخص نے ایک سامان خریدا، اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے، زبیدی نے ہزار با کوشش کی، مکہ کی بااثر شخصیتوں سے رابطہ کیا، لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق عین طلوعِ آفتاب کے وقت ابو قبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد مجلس جمائے رہتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو جھنجھوڑ دیا، زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور انھوں نے شریف لوگوں کو معاہدہ کی غرض سے عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا، اور طے کیا کہ مکہ میں کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے، اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے، چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا، اور زبیدی والے کا سامان حوالہ کیا گیا، اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی، آپ ﷺ بھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے، اتفاق سے اس معاہدہ میں اشرافِ مکہ میں تین ایسے لوگ شریک تھے جن کا نام فضل تھا، اسی مناسبت سے یہ تنظیم "حلف الفضول" کہلائی، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔

(البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۲، ۲۹۰ـ۲۹۱)

سیرت میں اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کو "میثاقِ مدینہ" سے موسوم کیا جاسکتا ہے، آپ ﷺ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تو وہاں ایک گروہ مہاجرین و انصار کا تھا، جو آپ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، اور دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو اہل کتاب میں سے تھے، اور غالباً خال خال مشرکین بھی موجود تھے، آپ ﷺ نے ان کے درمیان معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کی رو سے مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور خاندانی اکائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی، جان و مال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کیا گیا، اور یہ بات

طے پائی کہ اگر مدینہ پر باہر سے کوئی دشمن طاقت حملہ آور ہو تو سب مل کر مدافعت کا فرض انجام دیں گے، نیز اس معاہدہ میں ان قوموں کو بھی شریک کیا گیا جو کسی فریق کے ساتھ دوستی کا معاہدہ رکھتے ہیں۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۳؍۲۲۵)

صلح حدیبیہ کا مقصد بھی بین قومی امن وامان کو قائم رکھنا تھا، یہ بات قابل اظہار تعجب ہے کہ مسلمانوں نے طاقتور ہونے کے باوجود مشرکین مکہ کی تمام شرطوں کو قبول کرتے ہوئے یہ صلح کی، بعض حضرات کا خیال تھا کہ صلح کی یہ شرطیں یک طرفہ ہیں، اسی لئے حضرت عمرؓ وغیرہ کو یہ صلح پسند نہیں تھی، لیکن جنگ کے ماحول کو ختم کرنے اور امن کو حاصل کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے یہ قیمت ادا فرمائی، یہ صلح نہ صرف مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی، بلکہ ان دو فریقوں کی حلیف عرب قبائل سے مصالحت ہو، آپ ﷺ نے ان کو بھی صلح میں شریک قرار دیا، اس طرح اس "میثاق امن" کا دائرہ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہو گیا، یہ صلح بھی بقاء باہم اور ایک دوسرے کے بنیادی حقوق اور آزادی کے احترام کے اصول پر مبنی تھی۔

اس لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عالمی امن اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی ادارہ اور تنظیم کی تشکیل کا تصور دیا ہے، مجلس اقوام ہو یا اقوام متحدہ، یا اس طرح کی دوسری تنظیمیں، وہ اسی تصور کی بازگشت ہیں، یہ عجیب بدبختی ہے کہ اس وقت اقوام متحدہ کو کچھ مغربی اقوام نے اغوا کیا ہے، جن کے دباؤ کی وجہ سے غیر منصفانہ فیصلے ہوتے ہیں، اسرائیل کئی ملکوں کی سرحدات کو پار کر کے عراق کے نیوکلیر مرکز پر حملہ کر سکتا ہے، امریکہ غیر قانونی طور پر سوڈان اور افغانستان کے اندرونی حصوں کو نشانہ بنا سکتا ہے، روس چیچنیا میں معصوم شہریوں کو دیوانہ وار ہلاک کر رہا ہے، بوسنیا اور کوسوو میں روس نے کھلی جارحیت کا علانیہ تعاون کیا ہے اور نہ جانے کتنے ہی چھوٹے ممالک اور کمزور اقوام ہیں کہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہیں، اس کے باوجود فلسطین اور چیچنیا کے مظلوم مسلمان تو دہشت گرد کہلاتے ہیں، اور امریکہ و روس امن و انسانیت کے

اسلام اور تصورِ آزادی

آج کل شہروں میں چڑیا خانے (Zoo Logical Park) بنے ہوتے ہیں، ان چڑیا خانوں کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت پر بہت بڑی رقم خرچ ہوتی ہے، پورا چڑیا خانہ رنگ برنگ کے خوب صورت اور مہکتے ہوئے پھولوں، لمبے، ہرے بھرے درختوں اور پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں کی وجہ سے خوش منظر بنا رہتا ہے، پھر انواع و اقسام کے حیوانات اور پرندوں کے لئے الگ الگ احاطے بنے ہوتے ہیں، جانوروں کی دیکھ بھال اور آسائش کا جو انتظام ان چڑیا خانوں میں ہوتا ہے یقیناً وہ ان کو جنگلات میں بھی میسر نہیں، اپنی غذا کے لئے نہ ان کو شکار تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ چارہ ڈھونڈھنے کی حاجت، بلکہ خود چڑیا خانہ کا عملہ ان کی غذائی ضروریات وقت پر اور فراوانی کے ساتھ فراہم کرتا ہے، حفظانِ صحت کی جو رعایت یہاں کی جاتی ہے، جنگلات میں ان کا میسر آنا ممکن نہیں، باضابطہ ڈاکٹر اور معالج متعین ہیں، بلکہ ان کے علاج کی اتنی فکر کی جاتی ہے کہ انسانوں کے لئے بھی اتنی فکر نہیں کی جاتی، جانوروں کی حفاظت و صیانت کا بھی اعلیٰ درجہ کا نظام موجود ہے، نہ کسی جانور کو اس کا خطرہ ہے کہ اس سے زیادہ طاقت ور جانور اسے اپنی خوراک بنالے گا، نہ شکاریوں سے کوئی خوف ہے، غرض حیوانات کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چڑیا خانے ان کے لئے ایسی راحت گاہ ہیں کہ انسانوں کو بھی ایسی سہولت و آسائش میسر نہیں۔

لیکن اگر کسی شخص پر جانور کی زبان کھلے، وہ ان سے ہم کلام ہوسکے اور ان جانوروں سے ان کی دلی آرزو اور سب سے پیاری خواہش کے بارے میں سوال کرے تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوگا کہ خدارا ہمیں اس خوب صورت آراستہ و پیراستہ سونے کے قفس سے

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نہیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ان کی ناک نہ چھوڑ دیتے۔ پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمر بن جوزی، ص ۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روسو نے ۱۷۵۲ء میں بھی شکوہ کیا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔" یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوق انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انہوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں۔ ۳۰ رنومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھا۔ آج بھی امریکی صدر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گوری نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی لڑائی مسلمانوں نے شروع کی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال پر مشتمل ہے، اس کا پہلا نصف حصہ یعنی ۴۵ رسال زیادہ تر مسلمانوں ہی کی قربانی سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں ملک کا کوئی چپہ نہیں جس کو مسلمانوں نے اپنے خون اور لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہو، جنگ آزادی کا یہ حصہ جس میں سب سے زیادہ خون ریزی اور تباہی و بربادی ہوئی، مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی قربانیوں اور فدا کاریوں کی تاریخ ہے، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، ان کے علاوہ بہت خلفاء، علماء صادق پور، مولانا فضل حق خیرآبادی اور کتنے ہی علماء ربانی ہیں جنہوں نے اس عرصہ میں جان و مال کی زبردست قربانیاں دی ہیں۔

اگلے پچھتالیس سال میں جو مسلمان جنگِ آزادی میں شریک ہوئے ان میں غالب اکثریت علماء اور اہلِ دین کی تھی، خلافت کمیٹی، جمعیت علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ تو قائم ہی اسی مقصد کے لئے ہوئی تھیں، افسوس کہ لوگ ان تحریکوں کو فراموش کر گئے، انہوں نے صرف کانگریس کو یاد رکھا۔ جو محض انگریز کی خوشامد اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان روابط کو پروان چڑھانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، ریشمی رومال تحریک اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت میں بھی زیادہ حصہ علماء اور خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تھا۔ علماء اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی تحریکِ آزادی میں یہ پرجوش شرکت اور قربانی کیا اس لئے تھی کہ ان کو آئندہ حکومت میں حصہ داری کی طمع تھی اور وہ وزارتوں میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انہوں نے یہ سب کچھ تحسین و تعریف کی تمنا اور عہدہ اور مال و زر کی حرص و طمع سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی قوم کو غلام و محکوم بنا لینا ایک ایسا ظلم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا "جہاد" اور اس راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنا "شہادت" ہے۔

عدل کے نفاذ میں مساویانہ سلوک

گذشتہ کئی ہفتوں سے مشہور سیاسی قائد جناب بال ٹھاکرے کی گرفتاری اور ان کے مقدمے نے اتنی ہنگامہ خیز اور حشر انگیز صورت اختیار کرلی کہ گویا بکریوں کے ریوڑ میں کوئی شیر گھس آیا ہو، کمزور دل کمزور تن اور کمزور حوصلہ بکریاں چاہتی ہوں کہ شیر کو اس کی چیرہ دستیوں پر سزا دی جائے، اور کیفر کردار تک پہونچایا جائے، لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس طاقت ور درندہ کا ہاتھ تھام سکے، یہ ہے ہمارے ملک کی جمہوریت، قانون کی بالادستی، اور انصاف کی حکمرانی! اگر کوئی مسلمان، عیسائی یا دلت جناب بال ٹھاکرے کے مقابلہ دس فیصد کم بھی مجرم ہوتا تو شاید اب تک انکاؤنٹر ہو چکا ہوتا، ورنہ ٹاڈا کے تحت ضرور وہ موت سے زیادہ تکلیف دہ اذیتوں کا مستحق گردانا جاتا۔ لیکن یہاں ایک شخص علانیہ اپنی مجرمانہ روش پر مصر ہے، اور ملک کے پورے نظام قانون کو چیلنج کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود کیا مجال کہ کوئی اس کی زبان روک سکے، اور اس کے ہاتھ پکڑ سکے۔

تمام افراد اور قوموں کے ساتھ عدل کا تقاضا، رواداری اور انصاف کا برتاؤ اس ملک کی حفاظت کی ضمانت ہے، مختلف گروہوں اور الگ مذہب رکھنے والوں کی ناز برداری اور ان کے ساتھ خوش خلقی ودل داری، آج کے لئے نہایت ہی ضروری ہے، اور [illegible] عمل ہے، اسی لئے اسلام نے عدل اور عدل کے معاملہ میں مساویانہ سلوک کی قدم قدم پر تلقین کی ہے، رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی بابت حکم دیا گیا کہ جب آپ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پورا انصاف ملحوظ رکھیں: "وان حکمت فاحکم بینهم بالقسط ان الله یحب المقسطین" (المائدہ ۴۲)

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا۔ فتح مکہ کے موقع سے عرب کے معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے کچھ چوری کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جو اسلام میں چوری کی سزا ہے، آپ کے محبوب حضرت اسامہ بن زید ؓ نے اس خاتون کے حق میں سفارش کی، تو آپ اتنے برہم ہوئے کہ کم آپ ﷺ اس طرح غضبناک ہوا کرتے تھے، اور خاص اس موضوع پر صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے اس خطاب میں فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ محمد کی بیٹی فاطمہ نے چوری کی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے اس کے ہاتھ کاٹے گئے (بخاری عن عائشہ رضی اللہ عنہا، حدیث نمبر (۳۴۷۵) کتاب أحادیث الأنبیاء، باب "أم حسبت أن أصحاب الکهف والرقیم" الکهف:۹)

یہی مزاج آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پایا۔ حضرت ابوبکر ؓ نے ایک بار جمعہ کے دن اعلان کیا کہ کل اونٹوں کی زکوۃ لے کر یہاں حاضر ہوں، کہ ہم اسے تقسیم کریں، اور کوئی شخص میرے پاس بلا اجازت نہیں آئے۔ دوسرے دن ایک صاحب اونٹ کی نکیل لے کر آ گئے، کہ شاید تقسیم میں اونٹ مل جائے، تو لے جانے میں آسانی ہو۔ جس حصہ میں اونٹ رکھے گئے تھے، حضرت ابوبکر ؓ و عمر ؓ وہاں داخل ہوئے، ساتھ ہی یہ صاحب بھی آ گئے۔ حضرت ابوبکر ؓ کو اعلان کے باوجود ان صاحب کی بے وقت آمد پر غصہ آ گیا، اور آپ ؓ نے اونٹ کی نکیل لے کر ایک آدھ بار انہیں رسید کیا۔ جب حضرت ابوبکر ؓ اونٹ کی تقسیم سے فارغ ہوئے، تو اس شخص کو بلایا، اور ہاتھ میں نکیل دی اور فرمایا کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو، حضرت عمر ؓ نے عرض کیا کہ یہ وہ بدلہ نہ لے گا، اور نہ آپ اس طریقہ کو رواج دیں، حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ پھر قیامت کے دن مجھے کون اللہ سے بچائے گا، حضرت عمر ؓ نے کہا کہ آپ انہیں راضی کر لیں۔ حضرت ابوبکر ؓ نے حکم دیا کہ اسے ایک اونٹنی مع کجاوہ، ایک چادر اور پانچ دینار دیے جائیں، اور اس طرح اسے راضی کیا۔ (کنز العمال ۳/ ۱۴۷)

حضرت عمر ؓ کی عدالت میں ایک مسلمان اور یہودی کا مقدمہ آیا تو آپ ؓ

نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمایا (الترغیب والترہیب: ۳، ۲۳۵) حضرت عثمان ؓ کے بارے میں مروی ہے کہ اپنے غلام کی گوشمالی کی۔ تو پھر اس سے اصرار کرکے اپنے کان پکڑوائے اور جب اس کو لحاظ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ حق سے کان ملو، دنیا میں بدلہ ادا کردینا بہ مقابلہ آخرت میں بدلہ ادا کرنے کے بہتر ہے؟ (منتخب حیاۃ الصحابہ مولانا کاندھلوی، ۲۳۳) جعدہ بن ہبیرہ ؓ نے حضرت علی ؓ سے عرض کیا کہ آپ ؓ کے پاس دو شخص آتے ہیں، جن میں سے ایک آپ ؓ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت رکھتا ہے، اور دوسرا آپ ؓ سے اس قدر بغض رکھتا ہے کہ اگر بس چلے تو آپ ؓ کو ذبح کردے، لیکن آپ اس محبت رکھنے والے کے مقابلہ بغض رکھنے والے کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں، حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ اگر یہ فیصلہ میرے اختیار کی چیز ہوتی تو میں وہی کرتا جو تم خیال کرتے ہو، لیکن یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے۔ ”لو کان لی فعلت، انما ذا شیٔ للہ“۔ (حوالہ سابق ۲۳۳)

عدل میں مساویانہ سلوک کا حال یہ تھا کہ خود حضرت عمر ؓ اپنے عہد خلافت میں حضرت زید بن ثابت ؓ کے یہاں مقدمہ کے فریق بن کر آئے۔ حضرت زید ؓ نے ازراہِ احترام حضرت عمر ؓ کو اپنے قریب بٹھانا چاہا، حضرت عمر ؓ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور فرمایا کہ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ (کنز العمال: ۳، ۱۷۳) حضرت عمر ؓ کا اسی طرح کا واقعہ حضرت ابی ابن کعب ؓ کے اجلاس عدالت میں بھی پیش آنا منقول ہے۔

حضرت عمر ؓ ہی کے عہد خلافت میں ایک غسانی رئیس مسلمان ہوئے، اور مدینہ آئے، ان کا نام ”ایہم“ تھا، اسلام تو قبول کرلیا تھا، لیکن ابھی اسلامی مزاج و مذاق سے نا آشنا تھا۔ طواف کے درمیان لباس کا گوشہ ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا، طبع نازک کو گوارا نہ ہوا، اور تھپڑ رسید کردیا، مقدمہ دربارِ خلافت میں آیا، حضرت عمر ؓ نے فیصلہ فرمایا کہ بدو بدلہ لے گا، یا اس سے معاف کرانا ہوگا، ایہم کا مذاق جاہلی اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا، ایک دو دنوں کی مہلت لی، اور اسی درمیان راہِ فرار اختیار کی اور مرتد ہوگیا، حضرت عمر ؓ کو

ایک بڑے رئیس کے یوں چلے جانے سے کوئی ملال نہیں ہوا، بلکہ احقاقِ حق کی جو توفیق میسر آئی، اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

عدل و انصاف کے معاملہ میں اسلامی نظام نے عدلیہ کو پوری طرح آزاد رکھا ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کے لئے بھی اس میں مداخلت کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے عہد خلافت میں قاضی شریح کی عدالت میں ایک یہودی کے خلاف مقدمہ دائر کیا، اور گواہان کی حیثیت سے صاحبزادۂ گرامی مرتبت حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام قنبر کو پیش فرمایا، قاضی صاحب نے دونوں گواہیاں رد کر دیں، اور کہا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر ہے اور نہ غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قابل قبول، اور بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں اور امیر المومنین کے خلاف ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی کو بڑی شکست سے فتح کا سامان بنا دیا، یہودی غلطی پر تھا، اس نے مسلمانوں کے اس عدل کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اسلام سے مشرف ہوا۔

انصاف کو یقینی بنانے اور مساوات سلوک برقرار رکھنے کے لئے فقہاء نے قاضی کے لئے اس بات کو بھی منع کیا ہے کہ وہ مقدمہ کے فریقین یا جن لوگوں کا مقدمہ آنا متوقع ہو ان سے ہدیے قبول کرے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اکثر اونٹ کی ران پیش کیا کرتے تھے، اتفاق سے اسی شخص کا مقدمہ آپ کے سامنے آیا، اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ جیسے اونٹ کے ران کی ہڈیاں جوڑوں سے الگ کی جاتی ہیں اسی طرح آپ بھی اس معاملہ کا صاف صاف فیصلہ کر دیجئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کے اشارہ کو سمجھ گئے، اور قاضیوں کو خاص طور پر حکم جاری فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے گریز کریں۔ (کنز العمال: ۳/۷۷۰)

عدل پروری کا یہ معاملہ حضرات صحابہ ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ رعایا میں عدل و انصاف اور مساوات سلوک کو سامنے رکھا، خود ہندوستان کے مسلم سلاطین کے ایسے بیسیوں واقعات موجود ہیں، سلطان ناصر الدین محمود، تغلق اور غیاث الدین بلبن خاندان غلامان، سوری، اور مغل بادشاہوں میں کتنے ہی حکمراں گذرے ہیں کہ رعایا

ان کو بے لاگ عدل کے لئے ضرب المثل بنے ہوئے تھے، جہانگیر نے اپنے ایک نہایت مقرب وزیر مقرب خان کو ایک معمولی بڑھیا کی فریاد پر مقرب خان اور اس کے متعلقین کو سخت سزا دی (انگریزی بیان ۳۵۴)

آج کل فوج اور پولیس کے معاملہ میں اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، [illegible] کی فوج ۱۹۱۵ء میں بصرہ میں داخل ہوئی۔ بادشاہ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ بصرہ میں کچھ لوگوں نے رعایا کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ فوراً معاملہ کی تحقیق ہوئی اور بعض سپاہیوں کو سزائے موت دی گئی، اور بعضوں کی ناک کٹوا کر انہیں عام میں پھرایا گیا تاکہ پھر آئندہ ان کو ایسی زیادتی کی جرأت نہ ہو (انگریزی بیان ۱۸۱، سید صباح الدین عبدالرحمان)

جو جمہوریت انسان کو انصاف بھی نہ دے سکے، اور جو ظالم کا ہاتھ تھامنے میں بھی پچھڑے اور چہرے میں فرق کرتی ہو اس سے کیسے کوئی مظلوم اپنے حقوق کے تحفظ کی توقع رکھ سکتا ہے اور کیوں کر امید کی جا سکتی ہے کہ یہاں ظالموں کے ہاتھ تھامے جا سکیں گے۔

(۱۴ / ۱ / اگست ۲۰۰۲ء)

دہشت گردی اور اسلام

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن وسلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سروسامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور طاقت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو امن کی نعمت سے سرفراز فرمایا "أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ" (قریش: ۴)

دہشت گردی سماج کے امن وامان اور سلامتی کے لئے سم قاتل ہے۔ جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان ومال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت وآبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں تعمیری ترقی رک جاتی ہے، تمدنی تعاون وتحفظ ختم ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکرمند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے "مومن" اور "مسلم" یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے، مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم "سلم" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح وسلامتی کے ہیں، اسی طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

سلامتی حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری اجتماعات سے اپنی حجۃ الوداع کو خطاب فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے ان کے پڑوسی محفوظ ہوں، شر سے رہیں۔ (بخاری)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم و تعدی اور جبر و ستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجے سے نکلنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو بے لگام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لیں اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی تحریک چلائی گئی، بے شمار جانیں اس لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوق غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے تو یقیناً بہت سے نامناسب حوادثات پیش نہیں آتے ہوتے، تو کیا یہ جہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

نہیں اور یقیناً نہیں! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندو تاریخ میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جو بھگوت گیتا میں کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہی پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہونا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک "مقدس جہاد" ہے۔ قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے: "لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ" (النساء: ۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں۔ امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے، حالانکہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے ذریعہ ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے۔ اسرائیل، فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں، حالانکہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے، وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں۔ مصر، الاخوان المسلمون اور ترکی رفاہ کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، منظم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں، بمبئی اور سورت میں ظلم وجور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور رد عمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا۔ غرض یہ ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کرسکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہا جانا خود ایک "اخلاقی دہشت گردی" ہے اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اصول مقرر کردیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: جزاء

سیئۃ سیئۃ مثلہا (الشوریٰ: ۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار (ابن ماجہ) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جوابی نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پیچھے ان اسباب و محرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدباب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بنا دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستے سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور ناامیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نکسلائٹ تحریک اسی پس منظر میں ابھری ہے اور اسی احساس محرومی نے بہت سے گریجویٹ نوجوانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکٹھا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو آئین کی سرحد سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، جنوبی ہند کا کردار اور بابری مسجد کی شہادت والوں کے خلاف رشتہ طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب و عوامل پر توجہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل اور دہشت گردی کا ازالہ کئے بغیر محض طاقت سے ختم کرنے کی کوشش، بجھانے کے بجائے شعلوں پر پٹرول ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور قبائلیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے بہت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب و عوامل پر توجہ دی۔ سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر ابھارتی ہے، وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اول تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے عہدہ دار کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں "نہی عن المنکر" اور "شہادتِ حق" ہے۔ اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (مومنون: ۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے۔ خدا عفو و درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے یاد کیا، وہ زیادہ تر "رحمن و رحیم" ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ "رحمۃ للعالمین" ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خودرو پودے کی اکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا اس کو بدنام کرنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ ہے جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں؛ بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(۸ / نومبر ۱۹۹۸ء)

کی بنا پر کسی شخص کو سزا دینا درست نہیں، مجرم کا بچ جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کی
بات ہے کہ کسی بے قصور کو سزا دی جائے۔ یہی بات خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے،
اور نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے مہذب قانون جرم و سزا میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے،
محض شک و شبہ کی بنیاد پر اور بلا ثبوت کسی شخص کو مجرم تصور کر لینا اور اس کے ساتھ مجرموں
کا سا معاملہ کرنا قطعاً درست نہیں اور سراسر تقاضۂ انصاف کے خلاف ہے۔ افسوس کہ ان
دنوں نہ صرف شخصی و انفرادی بلکہ حکومتوں کی سطح پر بھی یہ رجحان عام ہوتا جا رہا ہے۔ چند سال
پہلے تک ہندوستان میں ٹاڈا کا قانون نافذ تھا، یہ بہت ہی تکلیف دہ قانون تھا، جس میں
عرصہ تک ملزم بلا ثبوت پولیس تحویل میں رکھا جاتا تھا، اسے سخت اذیت پہنچائی جاتی اور
طویل عرصہ تک اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوتی، اس قانون کے تحت ہزاروں افراد گرفتار
کئے گئے لیکن ایک فیصد مقدمہ میں بھی ان پر لگائے گئے الزامات ثابت نہیں ہو سکے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ جب مجرم معلوم ہو اور اقرار یا
ثبوت و شہادت سے اس کی تعیین ہو جائے تو صرف وہی شخص مستحق سزا سمجھا جائے گا، اس
کے بدلہ اس کے کنبہ، خاندان یا قوم کے دوسرے لوگوں کو مجرم تصور کرنا اور ان کے ساتھ
مجرموں کا سا سلوک کرنا درست نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان کسی قوم کے لوگوں کے
ہاتھوں مارا گیا تو یہ درست نہیں ہے کہ اس قوم کا جو شخص بھی ہمارے ہاتھ آجائے، ہم اس
کے ساتھ قاتل کا سا سلوک کریں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت "فیروز" نامی
ایرانی شخص کے ہاتھوں ہوئی، حضرت عمر ؓ کے صاحبزادگان پر اس واقعہ کا رد عمل ہوا اور
حضرت عبید اللہ نے "جفینہ" نامی عیسائی اور مدینہ میں مقیم بعض ذمیوں کو جوشِ انتقام
میں قتل کر دیا، حضرت عثمان ؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا معاملہ یہی زیر بحث
آیا۔ اس سلسلہ میں حضرت علی ؓ اور اکثر صحابہ کی رائے تھی کہ ان کو قصاص میں قتل کیا جانا
چاہئے، لیکن عمرو بن العاص نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا کہ یہ واقعہ آپ کے منصب امارت پر فائز
ہونے سے پہلے کا ہے، چنانچہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر اس واقعہ کے بارے
میں چشم پوشی سے کام لیا گیا، جب حضرت علی ؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دوبارہ

کا فیصلہ کرنے اور سزائیں جاری کرنے لگے تو پھر تو معاشرہ کا امن و امان ہی رخصت ہو جائے گا، قرآن مجید نے مقتول کے اولیاء کو یہ حق تو دیا ہے کہ وہ قاتل کے خلاف مقدمہ کا فریق بنے، لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطور خود قصاص کی کاروائی کرے، قصاص کی سزا بہر حال عدالت کے واسطہ سے ہی نافذ ہوگی۔

ہاں اس سے مدافعت کی صورت مستثنیٰ ہے، جب کسی کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ ہو تو اس کو اپنے دفاع کا بھرپور حق حاصل ہے، بلکہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک اپنے آپ سے دفاع واجب ہے، من شهر على المسلمين سيفا وجب قتله (ہدایہ ۴: ۵۶۷) — اپنی مدافعت میں اگر حملہ آور کی جان بھی چلی جائے تو مدافعت کرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، لو شهر على رجل سلاحاً فلا شيء عليه (ہدایہ ۴: ۵۶۷) — البتہ مدافعت میں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قتل سے کم تر درجہ کا اقدام کافی ہو جائے تو اقدام قتل سے گریز کیا جائے (دیکھئے بدائع الصنائع: ۷/۹۳) — حفاظت خود اختیاری نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور تمام مہذب قانون میں اس کو ہر شخص کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

غرض جذبۂ قصاص اور انتقام کے باب میں بھی اسلام کی تعلیمات نہایت واضح، منصفانہ، معتدل اور متوازن ہیں، مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، خواہ وہ حکومتوں کے درمیان ہوں، یا دشمنوں کے درمیان، بہر صورت یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات اور قرآنی ہدایات کو ملحوظ رکھیں، کوئی قوم کتنی ہی ہماری دشمن ہو، وہ زیادتی اور فساد پر کمربستہ ہو، ہمیں بہر حال یہ بات پیش نظر رکھنی ہے کہ عدل اور اعتدال کا راستہ نہ چھوڑ دیں۔ "ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا" (المائدہ: ۸)

(۱۸ مارچ ۲۰۰۲ء)

مفتوحین کے ساتھ سلوک

موجودہ عہد فکری اور تہذیبی ارتقاء کا عہد کہلاتا ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ تہذیب و ثقافت اور انسانی اقدار کا احترام جیسا کچھ آج کے عہد میں ہے، جو مغرب کے سیاسی غلبہ اور عروج کا عہد ہے پہلے کبھی نہیں تھا، لیکن یہ دعویٰ کس قدر مبنی بر حقیقت ہے؟ آئے دن کے واقعات اس پر گواہ ہیں، اس کی ایک مثال اس وقت "چیچنیا" ہے، یہ دوہرا رویہ ہی انصاف کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جارجیا، آرمینیا اور یوکرانیا جو عیسائی ریاستیں ہیں، انہوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو پورے مغرب نے ان کے اعلان آزادی کی حمایت کی اور روس کو اس کو منظور کرنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن اگر چیچنیا، انگوشتیا، داغستان اور قفقاز کی مسلم ریاستیں آزادی چاہتی ہیں تو نہ روس اسے قبول کرتا ہے اور نہ ہی مغرب اس کی تائید میں ہے، اور ان ریاستوں کی جنگ آزادی کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نام دیا گیا ہے۔

افسوس کہ ان مجاہدین آزادی کے ساتھ کوئی زبانی کلمۂ ہمدردی کہنے والا بھی موجود نہیں، حد یہ ہے کہ مسلم ملکوں نے بھی اس موقع پر ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ گویا اگر کچھ احتجاج کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ ہو جائے گا، سوائے ایک افغانستان کے چیچنیا کے قتل پر کوئی دو آنسو بھی گرانے والا موجود نہیں، یہ عالم اسلام کی ایسی بے حسی ہے کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے اور شاید جانور بھی اپنے ہم جنسوں کی ہلاکت پر ایسی خاموشی گوارا نہ کریں۔ بوسنیا میں کیسے کیسے قتل کئے گئے، اور مغرب خاموش تماشائی بنا رہا، کوسوو میں البانوی مسلمانوں پر کیا کچھ ستم نہیں ہوئے، لیکن انسانی ضمیر کو کوئی حرکت نہیں

ہوئی۔ چیچنیا کا سانحہ قرآن سب سے زیادہ سنگین ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگر انڈونیشیا کے ایک علاقے میں کچھ عیسائی آزادی کا مطالبہ کریں تو وہ مجاہدین آزادی ہیں، اور انڈونیشیا کو برضاء آزادی پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا جائے، اور چیچنیا کے مسلمان آزادی کے طلب گار ہوں تو وہ دہشت گرد اور غارت گر قرار پائیں۔

چیچنیا میں کیا کچھ مظالم ڈھائے گئے، اور کس کس طرح بے گناہوں کے خون سے پیاس بجھائی گئی؟ اس بارے میں بہت کم تفصیلات ذرائع ابلاغ تک پہونچ پائی ہیں، لیکن روسی فوجیوں کی خون آشامی کی ایک روایت رہی ہے، اور اس کی روشنی میں ان کے جور و ستم کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ابھی اخبارات کے ذریعہ ان مظالم کا ایک منظر جو سامنے آیا ہے تنہا وہی دل دہلا دینے کے لئے کافی ہے کہ چیچنیا کے سپاہیوں اور شہریوں کی نعشوں کے پیر رسیوں کے ذریعہ ٹرک سے باندھ دیئے گئے اور کھینچے گئے۔ اور بعض رپورٹوں کے مطابق زندہ سپاہیوں کو بھی گاڑیوں سے باندھ کر کھینچا گیا، یہ ایسی شرمناک اور نفرت انگیز حرکتیں ہیں کہ ان پر جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ حالانکہ بین الاقوامی قانون کے تحت جنگی قیدیوں اور جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی نعشوں کے ساتھ احترام برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسا کوئی واقعہ پیش آگیا ہوتا تو پورا مغرب و مشرق سراپا احتجاج بن گیا ہوتا، اور اس کو اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر انسانی رویہ اور اس کے مرتکبین کو دہشت گردی اور دہشت گرد کا عنوان نہیں دیا جاتا۔

مغرب میں انسانی خون سے آتش انتقام بجھانے کا ذوق زمانۂ قدیم سے ہے۔ یورپ میں اسلام سے پہلے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں "سیاقی" کے نام سے ایک غیر انسانی کھیل منعقد ہوتا تھا، قیدیوں کا جنگلی جانوروں یا خود دوسرے قیدیوں سے مقابلہ کروایا جاتا تھا، اور ان کی بے دردانہ ہلاکت کے تماشے نہایت ذوق و شوق سے دیکھے جاتے تھے، نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کروا دیا کہ ان کے کھانے پینے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں برداشت کیا جائے۔ بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا،

تو ستر ہزار مسلمان شہید کر دیے گئے، اور یہودیوں کو ان کے مقدس مذبح میں ایک ساتھ نذر آتش کر دیا گیا، خود عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق شہر میں ہر جگہ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اور اعضا نظر آتے تھے، یہ سلوک تو دوسری قوموں کے ساتھ تھا، خود عیسائیوں کے ایک فرقہ کا رویہ دوسرے فرقوں کے ساتھ کچھ کم جارحانہ نہیں تھا، ہسپانی اہتمام کے غلبہ و عروج کے زمانہ میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر جو عیسائی قتل کیے گئے، ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ مذہبی اختلاف کی بناء پر جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ان پر یہ سزا زندہ جلا کر جاری کی جاتی، ایسی قوم سے نمائشی دعووں کی امید تو رکھی جا سکتی ہے، حقیقی رحم کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے؟

اسلامی تعلیمات اس مسئلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اسلام سے پہلے عربوں میں مثلہ کا طریقہ تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتی تو ان کے اعضاء کی قطع و برید کرتی، بلکہ بعض تاریخی اور ادبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب تک پیا کرتے، خود رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کی نعش کا غزوۂ احد میں مثلہ کیا گیا۔ اسلام نے اس غیر انسانی طریقہ سے منع کیا، اور آپ ﷺ نے صراحتاً عین جنگ کے دوران بھی مثلہ کرنے کی ممانعت فرمائی، مقتولین کی نعشوں کے ساتھ کبھی بھی بے حرمتی کے رویہ کو آپ نے روا نہیں رکھا، غزوۂ بدر میں اہل مکہ میں سے بڑے بڑے سردار جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اور جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، وہ قتل ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے ان کی نعشوں کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا۔ بلکہ بدر ہی کے میدان میں ایک گڑھے میں مسلمانوں نے ان کو دفن کر دیا۔ غزوۂ خندق کے موقعہ سے مشرکین کی فوج میں سے ایک شخص خندق پار کر کے حملہ آور ہوا، اور قتل کیا گیا، اہل مکہ اس لاش کا معاوضہ ادا کر کے لاش حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس کا معاوضہ لینا گوارا نہیں فرمایا، اور یوں ہی لاش حوالے فرما دی۔

غزوۂ بنو قریظہ میں یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے حکم کے فیصلہ کی بناء پر خود یہودی

قانون کے مطابق قریب چار سو افراد قتل کئے گئے تھے، کیوں کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور معاہدہ شکنی کی تھی، اور اپنی دانست میں ایسا قدم اٹھایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی مملکت صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے، انہیں ان کے ساتھ بھی کوئی غیر انسانی رویہ نہیں برتا گیا۔ دوران کی نعشیں بھی دفن کی گئیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی سزائے قتل کا مستحق ثابت ہو جائے اور اسے قتل ہی کرنا ہو تو اچھے طریقہ پر قتل کرو، یعنی ایذا نہ پہنچا پہنچا کر اور بے دردانہ طریقہ پر اسے ہلاک نہ کیا جائے۔

ان اسلامی تعلیمات کا مسلمانوں پر ایسا اثر تھا کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ غلبہ پانے کے بعد ہمیشہ فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا، وہ جنگ کے میدان میں جتنے بہادر تھے صلح کی میز پر اس سے زیادہ وسیع القلب، جیسے میدان کارزار ان کی تلوار کی جھنکار سے لرز جاتے تھے، ویسے ہی ان کی صلح جوئی اور انسانیت نوازی دشمنوں کے دلوں کو فتح کرلیتی تھی، وہ میدان مقابلہ میں جتنے بلند ہمت تھے، صلح کی بزم میں اسی قدر مہربان، نرم خو اور بامروت، اسی لئے جو علاقہ ان کے ہاتھوں فتح ہوتا وہاں کی شکست خوردہ آبادی تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اخلاق، محبت اور مہر و وفا کی وجہ سے ان کی گرویدہ ہو جاتی، وہ انہیں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی ابر رحمت ان پر سایہ فگن ہو گیا ہے۔

جو لوگ آج مسلمانوں کو دہشت گرد اور جنونی قرار دے رہے ہیں وہ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں، اپنی انسانیت پروری کا جائزہ لیں، اور بتائیں کہ کیا کبھی مسلمانوں نے بھی اپنے مغلوب بلکہ محکوم دشمنوں کے ساتھ ایسا انسانیت سوز برتاؤ روا رکھا ہے؟ — ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے تئیں مسلمانوں کے ایسے رویے و سلوک کی ہرگز کوئی مثال نہیں ملے گی!

(۱۰/مارچ ۲۰۰۳ء)

تخفیف اسلحہ اور اسلام

۲۴ تا ۳۰ اکتوبر کا "ہفتہ" اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی سطح پر "ہفتہ تخفیف اسلحہ" کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اس کا مقصد پوری دنیا کو اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ وہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہتھیاروں میں کمی کریں کیوں کہ انسانیت کو تخت وتاراج اور تباہ وبرباد کرنے کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا، گویا مہلک اسلحہ کا ذخیرہ انسانیت کے لئے خودکشی کے مترادف ہے، اور اپنی قبر آپ کھودنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جو امن وامان کا نام لیتی ہیں اور اپنے آپ کو امن اور سلامتی کا پیغامبر تصور کرتی ہیں، یہی طاقتیں ہتھیاروں کی سوداگر ہیں، نت نئے مہلک ہتھیاروں کی منڈیاں گویا "انسانیت کی قتل گاہیں" یہی آراستہ کرتے ہیں، یہ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کو ہتھیار فراہم کرکے ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر اکساتے بھی ہیں، اور دوسری طرف صلح وامن کی تلقین بھی کرتے ہیں، مشرق بعید کے ممالک جاپان، کوریا، ملیشیا وغیرہ نے جب سے صنعتی طور پر پیش رفت کی ہے اور ایسی صنعتوں میں قدم بڑھایا ہے جو انسان کے لئے نافع اور فائدہ بخش ہیں، تب سے خاص طور پر مغربی ملکوں نے ہتھیاروں کی صنعت پر اپنی توجہ مزید بڑھادی ہے، اور اس بات کی بھرپور کوشش بھی کی ہے کہ مشرقی ممالک دفاعی ٹکنالوجی میں آگے نہ بڑھیں تاکہ اس جنگی اور ملکی سلامتی کے لئے ناگزیر صنعت میں ہماری اجارہ داری باقی رہے، اور پوری دنیا ہتھیاروں کی خریداری میں ہم پر ہی انحصار کرے، ایسی قوموں کی طرف سے دوسروں کو تخفیف اسلحہ کی تلقین یقیناً ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔

تاہم ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہئے۔ اسلحہ کی ایک قسم وہ ہے جو مجرم اور ظالم کو تنہا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، مثلاً تلوار ہے، جس شخص پر وار کیا جائے وہی اس سے متاثر ہوتا ہے، تیر اور بندوق ہے کہ ان کے نشانے بھی محدود ہوتے ہیں، آج کل جنگ کے موقعہ سے بندوقوں کا تکلف کر لیا جاتا ہے، اور میدان جنگ میں محدود نشانے تک وار کرنے والے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، ان کو بھی جنگی حالت میں ایسے ہی اسلحہ کے زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ فوج اور فوجی ٹھکانے ہی ان کا اصل نشانہ ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے ہتھیار وہ ہیں جو بہت دور تک کے علاقہ کو نشانہ بناتے ہیں، اور محض کوئی محدود جگہ ان کا ہدف نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک بڑے علاقہ کو اس امتیاز کے بغیر کہ وہ فوجی اہمیت کا حامل علاقہ ہے یا عام رہائشی علاقہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار، معذور، بے قصور شہری، جانور، مکانات، کھیتیاں اور غیر دفاعی صنعت پر مبنی کارخانے سب اس کا نشانہ بنتے ہیں، اس قسم کے ہتھیار بنیادی طور پر ظلم کی مدافعت کے لئے نہیں ہیں بلکہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے اور دوسروں کی زمین ہڑپنے کے لئے ہیں۔

مدافعت اسلام کی نگاہ میں افراد وشخص کا بھی اور ممالک واقوام کا بھی بنیادی حق ہے، اور جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت نہ صرف جائز بلکہ حتی المقدور واجب ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون أهله فهو شهيد"
(ترمذی ۱/۲۶۰، کتاب الدیات)

جو دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

اس لئے ایسا اسلحہ جو محدود نشانہ کا حامل ہو، اور مدافعت کے لئے کافی ہو، انفرادی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے مطلوب اور پسندیدہ ہے، غور کیجئے، صلح حدیبیہ میں مشرکین چاہتے تھے کہ مسلمان غیر مسلح ہو کر آئیں، اس وقت بھی آپ ﷺ نے ان پر اصرار

نیوکلیر اسلحہ ——— اسلامی تصور

دوسری جنگ عظیم کو جس بھیانک واقعہ نے اختتام پر پہنچایا، وہ یہ تھا کہ امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم برسائے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور سورج نے ابھی ابھی اپنی آنکھیں کھولی تھیں، لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس کے اوپر اٹھنے سے پہلے ہی جاپان کے دو بڑے شہروں پر موت کی شب تاریک چھا جائے گی۔ اس حملہ نے آن کی آن میں لاکھوں آدمیوں کی جان لے لی اور بے شمار انسان معذور اور اپاہج ہو گئے، انسانی اجزاء بکھرتے ہوئے بادلوں کی طرح فضا میں بکھر گئے اور آج بھی یہ زمین سبزہ سے محروم ہے۔

مغربی قوموں نے ایسا خطرناک اور ہلاکت خیز 'بم' محض اپنی قوت کے اظہار اور زیادہ سے زیادہ انسان کو کم سے کم وقت میں ختم کرنے کے شوق میں بنایا تھا، لیکن مشرقی قوموں کو خوف کی نفسیات نے نیوکلیر اسلحہ سازی کی طرف پیش قدمی کرنے کی طرف مجبور کیا۔ روس اور برطانیہ کے بعد چین نے اس فن میں دسترس پیدا کی۔ ہندوستان چین کے پڑوس میں ہے اور ہندوستان کے ایک قابل لحاظ علاقہ پر چین اپنی فوجی طاقت کی وجہ سے قابض ہے۔ ان حالات میں ہندوستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرے، چنانچہ گزشتہ دنوں ہمارے ملک نے بھی نیوکلیر تجربے کئے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ کو محض سیاسی اور وقتی نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہو، اور مظلوموں کی مدد اور

ظالموں کے پنجۂ ظلم کو تھام لینا ان باتوں میں سے ہے جس کو اسلام نہایت ہی تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ظالم بھائی کی بھی مدد کرو اور وہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ظلم سے روک دو۔ (بخاری: مطبع بیروت)

اس لئے اسلام نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے بلا امتیاز حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کے حق کو تسلیم کیا ہے، البتہ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی وہ افراط اور حد اعتدال سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام شاید پہلا نظام حیات ہے جس نے جنگ کے قوانین مرتب کئے اور عین حالت جنگ میں بھی تہذیب و شائستگی کا دامن نہ چھوڑنے کی تعلیم دی اور مفتوح قوموں کے حقوق اور ان کی نسبت سے فاتحین کی ذمہ داریاں متعین کیں۔ کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ قانون کی تاریخ میں بین الملکی اور بین قومی تعلقات اور حقوق پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی ہے جو "سیر کبیر" اور "سیر صغیر" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ خود مغربی مصنفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ بین قومی قانون پر لکھی گئی یہ پہلی کتاب ہے۔

قانون جنگ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بہت واضح ہیں۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی شخص کو جنگ کے درمیان بھی جلا کر قتل کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (بخاری: مطبع بیروت) آپ ﷺ نے اس پر اپنی ناخوشی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (بخاری: مطبع بیروت) آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے۔ (ترمذی: مطبع بیروت) کیوں کہ اس میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور عام شہری بھی حملہ کا نشانہ بن جاتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر ہدایت فرمائی:

"لا تقتلن امرأة ولا عسيفاً"۔ (ابو داؤد)

اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا عام رواج تھا، یعنی جب کسی قوم پر غلبہ حاصل کر لیا جاتا تو ان کے ناک، کان اور دوسرے اعضا کاٹ لیتے اور بعض شقی القلب تو ان کا ہار بنا کر پہنتے بھی تھے، آپ ﷺ نے اس غیر مہذب طریقہ سے بھی منع فرمایا۔

تاہم فقہ اسلامی کا ایک عام اصول ہے کہ جو چیزیں ممنوع ہوں، مجبوری کی بنا پر ان کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے مجبوری کی حالت میں آپ ﷺ نے جنگ میں منجنیق بھی استعمال فرمائی۔ یہ آپ ﷺ کے زمانے کا ایک ترقی یافتہ ہتھیار تھا، جس کے ذریعے دشمن کے قلعہ پر پتھروں کی چاندماری کی جاتی تھی، بعض اوقات دشمن سے محافظت کے لئے ہرے بھرے باغات بھی کاٹنے پڑے ہیں اور غیر ارادی طور پر ایسے لوگ بھی نشانہ کی زد میں آئے ہیں، جن کے بارے میں آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ ان پر حملہ نہ کیا جائے، اس سے کہ بعض اوقات ان کی مدافعت اور مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اقدامی طور پر تو نہیں، لیکن دفاعی نقطۂ نظر سے ایسے اسلحہ کا بنانا اور اس کی تیاری درست اور جائز ہے۔ لیکن اس کے استعمال میں پہل کرنا درست نہیں، جوابی اقدام کے طور پر اس کے استعمال کی گنجائش ہوگی، بلکہ نیوکلیر طاقت کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی زبان میں قوت مرہبہ ہے۔ (انفال: ٦٠) جو محض اس لئے ہے کہ دشمن کو مرعوب رکھا جائے اور ان پر ایک ہیبت طاری رکھی جائے کہ وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت سوزی اور خون آشامی کے لئے اس کو ذریعہ بنایا جائے۔

مغربی طاقتیں اس وقت جس طرح ایشیائی ممالک خصوصاً ہندوستان کو نیوکلیر اسلحہ سازی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں، وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں اور سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم میں ایک ایشیائی ملک کے خلاف اس طاقت کا استعمال کر کے تباہی مچا چکا ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اور ذمہ دار رویہ کا حامل تصور کرتا ہے اور جن ملکوں نے ہمیشہ صبر و تحمل کا رویہ اختیار کیا ہے، ان کو غیر ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نیوکلیر طاقت ایک ایسی صلاحیت ہے جو فریقین کو محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ و روس کی سخت باہمی کشاکش کے باوجود کوئی جنگ نہ ہو سکی۔ چین اور روس کے درمیان بھی سخت مخاصمت کے باوجود جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ خود ہمارے ملک ہندوستان نے جب سے ایٹمی دھماکہ کیا ہے، اس کے پڑوسیوں کو اس پر کوئی نئی جنگ کی ہمت نہیں ہو پائی۔ تاہم خود ایشیائی ملکوں کے حق میں یہ

بات سوچنے کی ہے کہ کیا ان کی سوشل قوت اس طرح کے اقدام کی متحمل ہے؟ جہاں آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے آسمان کے سائے کے سوا سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں اور کتنے ہی انسان ہیں کہ ہر سال فاقہ مستی ان کی جان لے لیتی ہے، کتنے ہی یتیم بچے ہیں کہ ان کے سر پر کوئی محبت کا ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ کتنی ہی بے کس بیوائیں ہیں جو اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کی حکومتیں ان کے درد کا مداوا کریں، پھر کیا ان طاقتور ترین نیوکلیر ہتھیاروں کے ذریعہ فاقہ مستوں کی بھوک بھی مٹائی جا سکے گی اور غریبوں کے آنسو بھی پونچھے جا سکیں گے؟؟

(۲۹ مئی ۱۹۹۸ء)

مزدوروں کے حقوق

کل یکم مئی ہے، "مئی" کا مہینہ آتے ہی مزدوروں کے حقوق و فرائض کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جا سکتا ہے اور یہ فطری بات ہے دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور ان کھاتی ہوئی نہریں، سب کو ان کے خون و پسینہ اور قوت بازو سے غذا ملتی ہے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے، حالانکہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں، جس میں تاجر اور مزدور دونوں کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال و توازن بھی ہے۔

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا، جو اب تک باقی ہے، کی نفی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی۔ (مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذر رضی اللہ عنہ)
- حلال روزی کی تلاش میں محنت و کاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امام عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔ (ابن عساکر عن عثمان رضی اللہ عنہ)

- چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ ﷺ نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا۔ (طبرانی عن کعب بن عجرہ)
- آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں سے کمائے (بیہقی عن علی بن رباح، طبرانی عن ابی بردہ ؓ) اور خدا کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی کھایا کرتے تھے۔ (بخاری عن ابی ہریرہ، مقدام ؓ)
- اللہ تعالیٰ ایسے مومن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت و حرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو (ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف) (طبرانی عن ابن عمر ؓ)
- آپ ﷺ نے فرمایا تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا (بخاری، ابن ماجہ عن ابی ہریرہ ؓ)
- کاشتکاری کو مبارک بنایا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔ (ابوداؤد عن علی بن حسین ؓ مرسلا)
- ایک بار آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام ؓ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال کمائی وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔ (دیلمی عن حکیم بن حزام ؓ)

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور موقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اُجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے، جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔ اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضور ﷺ نے غلاموں کے سلسلے میں درج ذیل ہدایات دی ہیں:

"وہ تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ دے تو پھر اس کی مدد کرے۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اصحاب کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے تھے، لباس اور ان کے تن کے کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے، ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابوذر غفاری رضی اور ان کے غلام دونوں اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود لے لیں تو ایک جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی دوسری دے دیں حضرت ابوذر رضی نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ کی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ (بخاری عن معرور رض)

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں ان کا معیارِ زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسب ضرورت بیوی رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) ہے اسے چاہئے کہ بیوی حاصل کرلے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کرلے (ابوداؤد عن مستورد بن شداد رض) حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رض نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا: میری قوم جانتی ہے میرا پیشہ میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں، اس لئے ابوبکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لئے کام کریں گے۔

(بخاری عن عائشہ رض)

اجرت کی ادائیگی

اجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کی جائے، اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کردی جائے اور سمجھا دی جائے۔

"ان رسول اللہ ﷺ نهى عن استئجار الاجير حتى

یبین له اجره"

رسول اللہ ﷺ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تاآنکہ اس کی اجرت واضح کردی جائے۔

پھر آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے (بخاری عن انس ؓ)۔
آپ ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، پس اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے (رجل استاجر اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه اجره) (بخاری عن ابی ہریرہ ؓ)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر (Employer) کام سے پہلے اجرت دیدے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگادی ہو، اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی، یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کردے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی۔ (الفتاویٰ الہندیہ ۴/۴۱۳)

کام کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت اور قدرت سے باہر ہو۔ (موطا امام مالک عن یحییٰ بن یحییٰ) یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات وغیرہ ہی کا تعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً اصول صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جاسکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقات کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں، ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا ادھیڑ عمر بوڑھوں سے اتنا کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان آدمیوں سے، اسلامی تعلیم کے تحت یہ ظالمانہ حرکت ہے، جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں ضروری ہے کہ ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے ملنے

کے لیے تعطیل ازی ہو اور بیماروں کے لیے خصوصی رعایت ہوں۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (ردالمحتار ۳/۸۸)

حسنِ سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور سرمایہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (اخوانکم) یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے۔ قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی حیثیت آجر (Employer) کی صفت یہ بیان کی گئی ہیں:

"وما ارید ان اشق علیک ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین" (القصص: ۲۷)

"میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، ان شاء اللہ تم مجھ کو صالح و نیک پاؤ گے۔"

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ ﷺ نے اف تک بھی کہا ہو یا پوچھا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (بخاری و شمائل ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ (بخاری) اسی حسنِ سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذاتِ خود بھی مدد کرے۔ (بخاری، مسلم)

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک ہوں۔ "مضاربت" کی اصل یہی ہے۔ مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت، پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم حسبِ تناسب تقسیم

پہلی قسم کے ملازم کو "اجیر مشترک" اور دوسری قسم کے ملازم کو "اجیر خاص" کہتے ہیں۔ اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا اور تاوان ادا کرے گا۔ اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری ۴/ ۵۵۵)

بندھوا مزدور

بندھوا مزدوری کی ظالمانہ رسم باوجود ارتقاء اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے، مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی، سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آزادی کو ضروری قرار دیا ہے۔ "وأما ركنها فالإيجاب والقبول" (الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۰۰، کتاب الاجارۃ) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل و حرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کی آزادی حاصل ہے، اور یہ اس کا خالصتاً ذاتی و شخصی مسئلہ ہے، وہ جہاں اور جس شہر و علاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے، کر سکتا ہے: "ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مراغما كثيرا وسعة" (النساء: ۱۰۰)

مزدوروں کی ذمہ داریاں

جہاں مزدوروں اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں، وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ:

"يا أبت استأجره إن خير من استأجرت القوي الأمين"

(القصص ۲۶)

''ابا جان! ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے
وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو''

یہاں اچھے مزدوروں کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: ایک قوت و صلاحیت اور دوسرے امانت و دیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے۔ اسی لئے فقہاء نے نا تجربہ کار طبیب (الطبیب الجاہل) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کام کی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء لکھتے ہیں:

''عدل کے ساتھ وزن کرو'' میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقات ملازمت کو پورا پورا خیال رکھیں۔ (معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب)

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے۔ رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کرے۔ حضور ﷺ نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہیں الراشی والمرتشی کلاھما فی النار (طبرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ)۔ رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عام لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہو کر ''ہدیہ'' اور ''نذر و نیاز'' کے نام سے پیش کریں۔ رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے لوگ بھی داخل ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کرے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے (ابوداؤد عن ابی امامہ رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عاملوں کو ہدایا وتحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں جو معصیت اور گناہ ہوں اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو، اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

"لایجوز الاستئجار علی شئی من الغناء والنوح والمزامیر ولا أجر لھم"

مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں"

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور کوئی شخص معاملہ طے پا جانے کے بعد یہ کام کر بھی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی، تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے۔

اسی حکم میں سنیما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے؟ اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا، اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے،

تو حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کردے اور ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے۔ چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"لو قال آجرتك هذه الدار سنة، كل شهر بدرهم جاز بالاجماع فلا يملك أحدهما الفسخ قبل تمام السنة من غير عذر" (فتاویٰ عالمگیری ۳؍۵۰۸)

"اگر کوئی شخص یوں کہے "میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلے ایک درہم، تو بالاتفاق جائز ہے اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے"۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آجائے تو یک طرفہ اقدام کیا جاسکتا ہے، مثلاً ملازم کو غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کرسکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازیٔ صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے ایسے ہی پرائیویٹ اداروں کا بھی ہے۔

(۳۰ راپریل ۱۹۹۹ء)

بچہ مزدوری ــــ اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حسین، تدبر، صاحب شعور، صاحب فہم اور طاقتور بنایا ہے، انسان کا نومولود بچہ اسی قدر فہم و شعور سے عاری اور عاجز و ناتواں ہوتا ہے، پرورش پانے کے بعد چند دنوں میں چلنے اور پھرنے لگتے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کے مطابق نفع و نقصان کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے، لیکن انسان ہے کہ مدتوں کروٹ بدلنے کی طاقت سے بھی محروم اور شعور و فہم کے ادراک سے بھی عاجز، رب کائنات نے ایسے کمزور، بے شعور بچے کی پرورش کا ایسا سروسامان کیا کہ نہ صرف والدین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی بچوں کے لئے محبت کی وافر سوغات رکھ دی، کون صاحب دل ہے جسے بچے کی معصوم مسکراہٹ اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو اور اس کا رونا اور بلکنا سخت سے سخت انسان کو بھی تڑپا نہ جاتا ہو؟ بچہ خواہ خوش رنگ ہو یا کالا کلوٹا، صاف ستھرا ہو یا میلا کچیلا، کسی کو شاہانہ عشرت میں پیدا ہوا ہو یا آشیانۂ غربت میں، اس کا بچپن کشش سے بھرپور ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی حساس اور فطرت سلیمہ کا حامل اسے دیکھے اور دل بھر نہ آئے! اور ماں باپ اور خاندان کے اہل تعلق کا کیا کہنا، ان کو تو اپنے بچوں کے معصوم چہرہ میں لالہ و گل کا نکھار اور غنچۂ گل کی بوئے عطر بار کا احساس ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی ایک ایک ضرورت کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ ان ہدایات میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ان کی کفالت اور ضروریات زندگی کی تکمیل، دوسرے ان کی تعلیم و تربیت، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری والد اور والد نہ ہوں تو حسب مراتب رشتہ داروں پر ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اسی لئے یتیم کی کفالت کرنے پر آپ ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے "انا و کافل الیتیم کھاتین" اور اس کی خاص ترغیبات حدیث میں منقول ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں آپ ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے

آلودگی ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی طاقت وقوت سے بڑھ کر کام ان سے کرایا جاتا ہے، اس سے ان کا معاشی مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور ان کے لئے پوری زندگی ایسی ہی معمولی مزدوری اور کم آمدنی پر انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا، وہ علم جیسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور ان کی جہالت کی وجہ سے ان کی اگلی نسلیں بھی پستی اور انحطاط کا شکار رہتی ہیں، یہ معاشی اور علمی محرومی ان میں اخلاقی گراوٹ اور تنزل بھی پیدا کرتی ہے، یہ تو ان کا اور ان کی نسلوں کا نقصان ہے۔

قوم وملک کے لئے بھی یہ بات کم نقصاندہ نہیں کہ قوم کا ایک اچھا خاصا حصہ مستقل پسماندہ رہے، وہ جسم صحت مند اور طاقتور نہیں ہوسکتا جس کا کوئی ایک عضو بھی بیمار ہو، پھر ان بچوں میں نہ معلوم کیسی کیسی ذہانتیں اور صلاحیتیں چھپی ہوں، اگر وہ بروئے کار آتیں تو ان سے سماج کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا تھا! اس لئے کہ کیچڑ میں بھی پھول کھلتے ہیں اور بے قیمت سیپوں ہی کی آغوش میں موتی پرورش پاتا ہے، اگر آپ شہر میں سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ہوٹلوں سے گذریں اور وہاں برتن دھونے اور میزیں صاف کرنے والے ننھے منے بچوں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں اور ان سے ذرا گفتگو کرلیں تو آپ بآسانی اندازہ کرسکیں گے کہ ان میں بیشتر بچے ذہین اور فہیم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں کی چمک ان کی صلاحیتوں کی چغلی کھاتی ہیں، مگر افسوس کہ ان پھولوں کے لئے ویران قبرستانوں پر چڑھنا اور مرجھا جانا ہی مقدر ہے۔

اس لئے بچوں کو قبل از وقت کسب معاش کی بھٹی میں جھونک دینا یقیناً اپنے قوم کے لئے ان کو ہمیشہ نقصان میں مبتلا رکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ضرر پہنچانے کی گنجائش نہیں، نہ ابتداءً اور نہ ردعمل میں لا ضرر ولا ضرار (موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، باب القضاء فی المرفق) نیز ارشاد ہے کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر سے دوچار کریں گے اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ بھی اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے۔

من ضار ضار اللہ و من شاق شاق اللہ علیہ۔ (ترمذی: ابواب البر، باب فی الخیانۃ والغش)

بچوں کے اس استحصال کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قومی سطح پر لوگوں کا ذہن

تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ سو درہم مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اگر حکومت عوام کو بچے
مزدوری سے روکنے کے لئے اشتہارات اور ایک سے ایک وسائل اختیار کرے اور قانون سخت
سے سخت بنائے لیکن ان مسائل کو حل نہ کرے جو اصل میں بچوں کو مزدوری پر لگانے کا سبب
ہیں تو یہ بے فیض ہوگا۔ بلکہ یہ مفلس و نادار گھرانوں کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہوگا،
اس لئے حکومت کو ایسے غریب خاندانوں کی کفالت کا مناسب نظم کرنا چاہئے اور ارباب
اقتدار کی آسائش اور تفریح گاہوں اور ایوانِ اقتدار کے در و دیوار کی آرائش پر جو کثیر رقوم
خرچ کی جاتی ہیں، ان کے بجائے جائز اور صحیح مصارف پر ان کو خرچ کرنا ہوگا۔

جو دوکاندار اور کارخانہ دار ان کم عمر بچوں کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کو
بھی چاہئے کہ قوم کے ان نونہالوں کے حقوق کو محسوس کریں، اول تو ان سے وہی کام اور
اتنا ہی کام لیا جائے جو ان کے لئے قابل برداشت ہو، آپ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں
بھی فرمایا کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے تو ان بچوں سے طاقت سے
زیادہ کام لینا کیوں کر روا ہو سکتا ہے، بچہ مزدوری کے سلسلہ میں بین الاقوامی سطح پر جو
معلومات جمع کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ بعض مالکان ان سے سولہ اور سترہ گھنٹے کام
لیتے ہیں اور نہایت قلیل مزدوری ادا کرتے ہیں، جو کھلا ہوا ظلم و جور ہے، دوسرے ان سے
کام لینے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام کیا جائے تاکہ ان کا مستقبل
سنور سکے، چنانچہ آپ ﷺ نے غلاموں اور باندیوں کی بہتر تعلیم وتربیت کی تلقین فرمائی
ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خادموں اور خادماؤں سے جہاں کام لیا جائے وہاں
ان کی تعلیم وتربیت کی بھی فکر کی جائے، تیسرے ان کو ان کی پوری مزدوری ادا کی جائے،
ایسا نہ ہو کہ ان کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام زیادہ لیا جائے اور پیسے کم دئیے
جائیں، یہ ناانصافی اور استحصال بھی کم تولنے اور کم ناپنے میں داخل ہے۔

"بچے" اور کم عمر کا اطلاق کس سن و سال کے لڑکوں اور لڑکیوں پر ہوگا؟ اس سلسلہ
میں جدید میڈیکل تحقیق کی روشنی میں ۱۴ سال کی عمر طے کی گئی ہے، حیرت انگیز طور پر
بڑے چھوٹے کی تحدید کے لئے جو عمر رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی یہ وہی عمر ہے، حضرت

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر مجھے جہاد میں شرکت کے سلسلے میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے مجھے قریب ۱۴ برس ہونے کی اجازت نہیں دی، پھر جب غزوۂ خندق میں پیشی ہوئی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی، جب نافعؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے یہ واقعہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہی بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق ہے، چنانچہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کہ جو لڑکے پندرہ سال کے ہوگئے ہوں ان کے لئے فوجی خدمت کا وظیفہ مقرر کردیں (بخاری باب بلوغ الصبیان ج ۲) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت تحت مزدوری کے معاملے میں ۱۸ سال سے لڑکے کو بالغ تصور کرتی ہے لیکن نکاح وغیرہ میں نابالغ۔ اسلامی نقطہ نظر سے لڑکے اور لڑکیاں اس عمر میں تمام حقوق اور ذمہ داریوں میں بالغ تصور کئے جائیں گے، کہ اس عمر میں جسمانی نشوونما اور شعور وادراک دونوں ہی جہتوں سے انسان پختہ ہو جاتا ہے۔

(۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء)

ماحولیاتی آلودگی اور اسلام

ابھی چند دنوں پہلے "عالمی یوم تحفظ ماحولیات" منایا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کا مسئلہ اس عہد کا نہایت اہم اور سنگین مسئلہ بن کر ابھرا ہے اور اس وقت تمام دنیا کو اس نے اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔ کئی عالمی کانفرنسیں اس موضوع پر ہو چکی ہیں اور اس کے لئے ممکنہ تدابیر پر نہایت سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ پوری دنیا میں غور کیا جا رہا ہے۔

یوں تو ماحول میں کثافت پیدا کرنے والی بہت سی چیزیں خود قدرت نے انسانی اور حیوانی جسم میں رکھی ہے، جیسے پیشاب، پاخانہ، مردار جسم سے پیدا ہونے والا تعفن وغیرہ، لیکن عصر حاضر کی صنعتی اور مشینی ترقیوں نے ماحولیاتی کثافت کے اسباب میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ کارخانوں سے خارج ہونے والے فضلات، پٹرول، ڈیزل کے ایندھن، ایرکنڈیشن اور ریفریجریٹر وغیرہ سے خارج ہونے والی گیسیں، ڈیزل اور پٹرول کے ایندھن پر چلنے والی ٹریفک کی کثرت، یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو انسان کو راحت و سہولت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اور غیر محسوس فضائی اور ماحولیاتی کثافت کا تحفہ بھی دے جاتی ہیں۔

نظام قدرت میں توازن کی ایک مثال یہ ہے کہ جہاں اس نے کثافت پیدا کرنے والے قدرتی وسائل عطا کئے ہیں، وہیں اس نے کثافت کو تحلیل کرنے اور انسانیت کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے کچھ قدرتی اور فطری ذرائع بھی پیدا کئے ہیں، جیسے سمندر، کہ اس کا کھارا پانی آلودگی کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح درخت اور جنگلات، یہ جہاں انسان کو صاف و شفاف ہوا فراہم کرتے ہیں، وہیں فضا میں پھیلی ہوئی آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، خود وہ مٹی جس میں ہم

نہیں، بلکہ یہ عالمی اور بین قومی مسئلہ ہے۔ اسلام جو ایک عالمگیر، جغرافیائی سرحدوں سے ماورا اور زمانہ و عہد کی قید سے آزاد مذہب ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس اہم مسئلہ سے صرف نظر کرے۔ اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایات و ارشادات سے اس سلسلہ میں روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہر اس بات سے منع فرمایا جو ماحول کو گندہ اور آلودہ کرتی ہے اور انسانی سماج کے لئے روحانی یا جسمانی لحاظ سے مضرت رساں ہے۔

چنانچہ حضرت معاذ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین مقامات پر قضاء حاجت سے منع فرمایا: ایسی جگہ پر جہاں مسافرین سر راہ پڑاؤ کرتے ہوں، راستے پر، اور درخت کے سایہ میں۔ (ابوداؤد: ۱۴۱/۱۲) اسی طرح آپ ﷺ نے اس کی بھی تلقین فرمائی کہ قضاء حاجت کے لئے آبادی سے دور کی جگہ کا انتخاب کیا جائے، بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ ضرورت کے لئے مکہ سے قریب دو میل کی دوری پر واقع مغمس نامی مقام پر تشریف لے جاتے تھے۔ (مجمع الزوائد ۲۰۳/۱) آپ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی برتن میں پیشاب کر کے اسے گھر میں رکھا جائے۔ (طبرانی عن عبداللہ بن یزید)

پانی کی حفاظت کی خاص طور پر آپ ﷺ نے تاکید فرمائی، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہرے اور رکے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ (ترمذی) اور حضرت جابر ؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۲۰۴/۳) اور خاص طور پر آپ ﷺ نے حمام اور غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (ابوداؤد و ترمذی عن عبداللہ بن مغفل)

جن چیزوں سے ماحول آلودہ ہوتا ہے، ان کو زمین میں دفن کرنے کی ہدایت دی گئی۔ اسلام میں مردوں کی تدفین کا نظم قائم کیا گیا، جو حیوانی مردہ اجسام سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے، اسلام نے جیسے مسلمانوں کی تدفین کا حکم دیا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کی نعش کو بھی دفن کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر

غور کیجئے کہ قرآن مجید نے ہابیل و قابیل کے واقعہ میں کوے کو زمین میں دبانے کا ذکر کیا ہے۔ (مائدہ: ۳۱) یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ مردار کو بھی یوں ہی نہ چھوڑنا چاہئے، بلکہ ان کو بھی مٹی کے نیچے دبادینا چاہئے اور کچھ اسی پر موقوف نہیں، دوسرے اجزاء جسم جن سے تعفن پھیل سکتا ہو اور آلودگی پیدا ہوتی ہو، ان کو بھی دفن کر دینے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ام سعدؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خون کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مجمع الزوائد: ۵/۱۷۹ بحوالہ طبرانی) اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ناک سے نکلنے والی آلائش کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند بزار، مجمع الزوائد: ۱۷۹/۸) اسی لئے فقہاء نے خود تین کو ماہواری کے زمانہ کے آلودہ کپڑوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

درخت کی حفاظت کی بھی آپ ﷺ نے خصوصی ہدایت دی اور شجر کاری کی ترغیب بھی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ)

اسی لئے بعض صحابہؓ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ خاص اسی نیت سے درخت لگایا کرتے تھے (مجمع الزوائد: ۴/۶۸۔۶۷) اسی لئے اسلام میں افتادہ سرکاری اراضی کے بارے میں یہ اصول مقرر کیا گیا کہ جو شخص بھی اس میں کاشت کرنا چاہے، حکومت کی اجازت سے کرسکتا ہے۔ (ابوداؤد) اگر کوئی شخص ایسی اراضی قبضہ میں لے کر پھر اسے آباد کرنا چھوڑ دے، تو زمین اس سے لے کر دوسرے کو حوالہ کر دی جائے گی، تا کہ وہ اس میں کھیتی کرے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/۳۰۳)

جہاں آپ ﷺ نے شجر کاری اور زراعت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، وہیں آپ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ درخت بے ضرورت کاٹے جائیں۔ عرب میں زیادہ تر ببول اور بیری ہی کے درخت ہوا کرتے تھے، آپ ﷺ نے بیری کے درخت کے بارے میں

فرمایا کہ اس کو کاٹنے والے اوندھے منہ جہنم میں جائیں گے۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۱۵) ایک ضعیف حدیث میں ایسے شخص پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے۔ (طبرانی عن علیؓ) یہاں تک کہ جنگ میں بھی اسلام نے کھیتیوں اور درختوں کو جلانے اور نقصان پہنچانے کو ناپسند فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جو کسی علاقے پر غلبہ پانے کے بعد وہاں کے کھیتوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (البقرۃ: ۲۰۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مجاہدین کو خاص طور پر درختوں اور کھیتوں کے برباد کرنے سے منع فرمایا۔

(ترمذی عن ابی بکر الصدیقؓ)

یہی حال حیوانات کا ہے۔ آپ ﷺ نے بلا ضرورت، محض شوقیہ شکار کرنے اور حیوانات کے ہلاک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔ آج کل جو مضر صحت گیسیں، مشینوں اور موٹروں سے خارج ہوتی ہیں، ظاہر ہے عہد نبوی میں یہ وسائل انسانی تصرف میں نہیں آئے تھے، لیکن اس سلسلے میں بھی احادیث میں اشارہ موجود ہے۔ خواہ مخواہ چراغ کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا گیا۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ صبح کے وقت چراغ جلانے کو ناپسند فرماتے تھے۔ (طبرانی، مجمع الزوائد ۸/۱۱۶) اسی طرح آپ ﷺ نے سوتے وقت چراغ کو گل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند احمد، مجمع الزوائد ۸/۱۱۰) ظاہر ہے کہ اس تدبیر سے تیل کا دھواں کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کے برتنے اور استعمال کرنے کے سلسلے میں دو بنیادی اصول بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بھی شئی کا اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچے "لا ضرر ولا ضرار" دوسرے جن چیزوں کا استعمال جائز ہے اور جو وافر مقدار میں آدمی کو فراہم ہو، ان کو بھی بے محل استعمال نہ کیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں "اسراف و تبذیر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے پانی تک کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے منع فرمایا اور وضوء و غسل میں بھی محتاط طریقے پر پانی کے استعمال کا حکم فرمایا۔ جو شریعت پانی میں اسراف کو گوارا نہیں کرتی ہو، وہ پٹرول، ڈیزل، کیروسین اور الموینم گیس وغیرہ جیسے قیمتی

قدرتی اسباب کے استحصال کو کیوں کر گوارا کر سکتی ہے، جس میں انسان کا ضیاع بھی ہے اور دوسروں کے لئے مضرت اور نقصان بھی۔ یہ بنیادی اصول ہیں جن سے ماحول کو آلودہ کرنے اور نقصان پہنچانے والی اشیاء کے غیر محتاط اور بے جا استعمال کا حکم سمجھا جاسکتا ہے۔

(۱۹/جون ۱۹۹۸ء)

عبادت گاہوں سے صوتی آلودگی پھیلنے کا مسئلہ

۳۰؍ اگست ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ عبادت کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے، اس فیصلہ میں عبادت گاہوں میں ڈھول پیٹنے اور لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ”کوئی بھی مذہب اس کی تلقین نہیں کرتا یا ترغیب نہیں دیتا، کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال امن وسکون میں خلل ڈالتا ہے، ضعیف معذور افراد، طلبہ اور شیر خوار بچوں کو بھی پُرسکون فضا میں نیند لینے کا فطری حق حاصل ہے۔۔ اور یہ غیر متوازن آواز صوتی آلودگی کا سبب ہے“ —— یہ فیصلہ چرچ آف گاڈ انڈیا کی اپیل کے پس منظر میں سامنے آیا ہے، مدراس ہائیکورٹ نے حکومت تمل ناڈو کو ہدایت دی تھی کہ شور شرابہ پر تحدید سے متعلق قوانین کی پابندی کرائی جائے، اور مذکورہ چرچ کو اس بات کا پابند بنایا جائے کیونکہ کے . کے . آر میجسٹک کالونی، ویلفیر ایسوسی ایشن کی درخواست کے مطابق یہ چرچ صوتی آلودگی پیدا کر رہا تھا۔

چونکہ فیصلہ کا پورا متن اخبارات میں نہیں آیا ہے، اور تفصیلات غیر واضح ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت نے اس بارے میں کیا تحدیدات عائد کی ہیں، کیونکہ حسب ضرورت سامعین تک آواز پہونچانے کا نظم ایک بنیادی ضرورت بھی ہے، اور بنیادی انسانی حق بھی، یقیناً عدالت کا مقصد ایسی جائز صورت پر امتناع عائد کرنا نہیں ہوگا۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صوتی آلودگی کا تعلق صرف مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہی سے نہیں ہے، بلکہ غیر مذہبی مقاصد کے لئے بھی وہ اسی قدر مضر اور تکلیف دہ ہے۔ اور شاید سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اس سلسلہ میں تنبیہ وہدایت کی زیادہ مستحق ہیں، لیکن مسئلہ بہرحال اہم ہے، اور اس پر اعتدال وعدل کے ساتھ عمل کرانے کی ضرورت ہے، عدل کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے قوانین

ایجنٹوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں، اور اکثریت کے ساتھ خون معاف ہوتے ہیں
حکومت تحفظ امن کے نام پر پہلو تہی برتتی ہے اور عدالت بھی ان کے معاملہ میں بے حس
ہوتی ہے، اس وقت حیدرآباد میں گنیش تہوار کی تیاری چل رہی ہے، اور گلی کوچوں میں کان
کو بہرا کر دینے والی آوازوں کا گویا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے جو تھامے نہیں تھمتا ہے، یہ
شور اکثر اوقات بلا وقفہ چوبیس گھنٹے جاری وساری رہتا ہے، پہلے لوگ خود گاتے اور نعرے
لگاتے تھے، اس لئے قدرتی طور پر ایک حد قائم رہتی تھی، لیکن اب آدمی کی جگہ ٹیپ ریکارڈ
نے لے لی ہے، اس لئے وہ بلا تعب وتھکن دن ورات نغمہ ریز رہتا ہے، اور بہت سے لوگ
جو آواز کے معاملہ میں نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، وہ کروٹ بدلتے اور نیند کو مناتے صبح
کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا عدالتیں اور حکومتیں ان مواقع پر بھی اسی طرح حرکت میں
آئیں گی جیسا کہ انھوں نے ایک چرچ کے بارے میں "فرض شناسی" کا اور بیماروں اور
معذوروں کے حقوق کی پاسداری کا ثبوت دیا ہے۔

جہاں تک آواز کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو وہ یہی ہے کہ آواز
حد اعتدال میں رہنی چاہئے، ضرورت سے زیادہ آواز کے بلند کرنے کو اسلام پسند نہیں کرتا،
عربوں کا ایک عجیب مزاج تھا کہ وہ آواز کی بلندی کو باعث افتخار جانتے تھے، اور پست
آواز کو وجہ ذلت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ عرب شعراء بھی کسی انسان کے جانور کی
طرح بلند آواز ہونے کو بطور مدح وتعریف کے ذکر کرتے تھے، (دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۴؍۷۲)
قرآن مجید نے اس غلط سوچ پر تنبیہ کی اور ارشاد فرمایا:

> "اپنی چال میں اعتدال رکھو، اور اپنی آواز کو پست رکھو کہ سب
> سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے۔" (لقمان: ۱۹)

گدھے کی آواز چونکہ بہت تیز اور ناہموار ہوتی ہے، اس لئے اس کو سب سے مکروہ
آواز قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ضرورت سے زیادہ اونچی آواز
میں تکلف بھی ہے اور دوسرے کے لئے تکلیف بھی "فان الجهر باكثر من الحاجة
تكلف يؤذی" ۔ (الجامع لاحکام القرآن: ۱۴؍۷۱) علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی آواز کو

گدھے کی آواز سے مشابہ قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معتدل آواز ناجائز اور مذموم ہے۔ (ابن کثیر ۴۴۴/۳)

عام حالات میں تو آواز کو معتدل رکھنے کا حکم ہے ہی، دعا و اذکار اور دینی اعمال میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آپ ایک بار رات کے وقت باہر نکلے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ مصروف نماز ہیں، اور بہت ہی دھیمی آواز میں قراءت کر رہے ہیں، پھر حضرت عمرؓ کے پاس سے گذر ہوا، وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے، اور بہت زور زور سے قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے، جب آپ کے پاس دونوں بزرگ حاضر خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے آہستہ قرآن پڑھنے کی وجہ پوچھی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ جس ذات سے میں سرگوشی کر رہا تھا، میں نے اس کو تو سنا دیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو میری آواز سن لی، حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ تم اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اللہ کے رسول! میں سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو تلقین فرمائی کہ وہ کسی قدر اپنی آواز کو بلند کریں، اور حضرت عمرؓ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی آواز کو پست کریں (ابوداؤد حدیث نمبر ۱۳۲۹) معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں بھی آواز کو معتدل رہنا چاہئے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں معتکف ہوئے، اور لوگوں کو زور زور سے قراءت کرتے ہوئے سنا، تو پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا کہ تم سب اپنے رب سے سرگوشی کر رہے ہو، تم ایک دوسرے کو تکلیف نہ دو، اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو۔ (ابوداؤد حدیث نمبر ۱۳۳۲) بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع پر قرآن کو زور سے پڑھنے کی خصوصی ہدایت نہیں ہے، ان مواقع پر آہستہ قرآن پڑھنا افضل ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کو زور سے پڑھنے والا کھلے عام صدقہ کرنے والے کی طرح ہے، اور قرآن کو آہستہ پڑھنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی مانند ہے، الجاہر بالقرآن کالجاہر بالصدقة والمسر بالقرآن کالمسر بالصدقة

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۳۳۳)

فقہاء نے بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

"و یجہر الامام وجوبا بحسب الجماعۃ فان زاد علیہ اساء" (الدر المختار مع الرد ۲۴۹/۲)

امام جماعت کے اعتبار سے ہی جہر کرے گا، اگر اس سے زیادہ زور سے پڑھے تو اس نے نامناسب عمل کیا۔

اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ اتنی بلند آواز جو خود اس کو تھکا دے، اور دوسرے کے لئے اذیت کا باعث ہو، اچھی بات نہیں، (رد المحتار ۲۴۹/۲) — اس سے معلوم ہوا کہ بعض سیدھے سادے مسلمان بھائی جو مسجد میں نماز کے لئے بیرونی مائک کا استعمال کرتے ہیں، جس کی آواز مسجد سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں پھیلتی ہے، یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں، کیونکہ جیسا کہ مذکور ہوا خود رسول اللہ ﷺ نے قراءت قرآن میں آواز کے بہت بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے، دوسرے اس میں قرآن مجید کی اہانت کا اندیشہ بھی ہے، کیونکہ قرآن کے احترام کا تقاضا ہے کہ سننے والے پوری طرح قرآن کی طرف متوجہ اور یکسو ہیں، اور غور سے سنیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں، بات چیت کرتے رہتے ہیں، کاروبار کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اور قرآن کے سننے کا حق ادا نہیں ہوتا، گویا ہم لوگ بالواسطہ قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بنتے ہیں۔

اسلام میں صرف اذان کے لئے بلند آواز کو پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا مقصد ہی اظہار و اعلان ہے، اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ ہی کو اسی لئے اس خدمت پر مامور فرمایا کہ ان کی آواز بلند تھی، (ترمذی) لیکن اذان میں بھی ایسی ہی آواز مطلوب ہے جو اہل محلہ تک پہونچ جائے، سیدنا حضرت عمرؓ کے سامنے ایک صاحب نے اذان دی، اور آواز کو بلند کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا تو آپؓ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (تفسیر قرطبی ۱۲/۱۷) — پھر اذان ایک مختصر سا عمل ہے، جو زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے، جو غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی

اذیت کا باعث نہیں ہوتی۔

موسیقی، گانا بجانا، ڈھول باجے، رقص وسرود، نعرہ بازی، بے وقت اور بے محل نعرے، آرام غارت کردینے والی تقریریں اور شور و ہنگامے، تو اسلام ان کا قائل نہیں۔ بلکہ ایسے تکلیف دہ رویہ کو ناپسند کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو بازار میں اور میدان جنگ میں بھی بے جا شور و شغب پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی بازار میں شور و ہنگامہ کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں: ان اللہ یبغض صخاب فی الاسواق (موارد الظمآن، حدیث نمبر: [illegible]) ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج میں اسلامی زندگی کے صحیح خدوخال پیش کریں۔

جانور اور اسلامی تعلیمات

اسلام کا ابر رحمت صرف انسانوں پر ہی نہیں برسا، بلکہ اس نے پوری کائنات کو آبیار کیا، جہاں اس نے خلق انسان کو اپنے کرم سے سرفراز فرمایا، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال کیا۔ انسان جب شقاوت پر آتا ہے اور ظلم و جور اس کی طبیعت بن جاتی ہے تو پھر اس کے ظلم و جور کی کوئی نہایت نہیں رہتی، وہ بے زبان جانوروں پر بھی مشق ستم کرنے لگتا ہے اور تہذیب و شائستگی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں کے نزدیک بسر اوقات کا ذریعہ یہی جانور تھے، ان کا دودھ غذا کا کام دیتا، ان کی پشت سواری اور بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ان کی تجارت کا دار و مدار انہی سواریوں پر تھا، ان کے چمڑوں سے بھی مختلف کام لئے جاتے تھے، لیکن ان سب کے باوجود جانوروں کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ اور جفا کارانہ تھا۔

آپ ﷺ نے ایسے غیر انسانی سلوک کو منع فرمایا، جانور کے منہ پر مارنے کی ممانعت کی، لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس پر بندش لگا دی، جانور کی خوراک اور ضروریات کی رعایت کرنے کا بھی حکم دیا، ایک اونٹ کو دیکھا کہ اس کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، اسی سلسلہ میں ایک معجزہ بھی ظاہر ہوا، ایک اونٹ نے اپنے مالک کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اس کے مالک کو تنبیہ فرمائی، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر سرسبز و شاداب موسم میں سفر کرو تو آہستہ چلاؤ اور جانوروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دو، اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ، آپ ﷺ نے اس بات کی بھی تلقین کی کہ جو جانور جس کام کے لئے ہے اس سے وہی کام لو، آپ ﷺ نے "منبر" کے طور پر جانور سے کام لینے سے منع فرمایا۔ جانور کو منبر نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جانور کو اسٹیج کے طور پر استعمال نہ کیا جائے کہ اس پر

کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص بیل پر سواری کر رہا تھا اللہ کی قدرت خاص سے بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا میں اس کام کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں ـــ "انی لم اخلق لھذا"۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخرت کا ثواب و عذاب جانوروں کے ساتھ اچھے اور برے سلوک سے بھی متعلق ہے، قیامت کے دن ایک عورت محض اس لئے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ خود کھائے اور چر کر اپنی ضرورت پوری کرے اور ایک شخص اس بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دور کی ہوگی، اسے پانی پلایا ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتوں میں سے چرند پرند جو کھالیں اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

اسلام نے گوشت خوری کی اجازت ضرور دی ہے لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے۔ کسی صاحب نے ایک گوریا کا بچہ پکڑ رکھا تھا، اس کی ماں بے قرار تھی، آپ ﷺ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا ضرورت ایک گوریا کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے۔ اسی لئے جو چیزیں انسانی کام نہیں آتیں، آپ ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ہدہد وغیرہ کے مارنے کی آپ ﷺ نے صراحتاً ممانعت فرمائی، کسی ذی روح کے جلانے کو آپ ﷺ نے شدت سے روکا ہے، ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولہا سلگایا جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ ﷺ نے چولہا بجھانے کا حکم دیا، خود قرآن مجید میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے، جن کے لشکر سے چیونٹیاں خائف ہو گئی تھیں، اسی قریب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔ اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندو مذاہب کے سوا دنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو

ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی تر وید مذہب میں بھی سوائے "جین مذہب" کے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ محض اپنے مذہب اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔ رگ وید میں ہے:

"اے اندرا! تمہارے لئے پوشان اور وشنو ایک سو بھینسیں پکائیں۔"

(رگ وید ۶/۱۷/۱۱)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گائیوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجر وید ادھیائے ۲۰)

منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

"مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑ بکرے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔" (منوسمرتی ادھیائے ۳، ۲۶۸)

مہاتما گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانہ تک ہندوستان میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تارا چند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے بڑے ریوڑ بھی ہوا کرتے تھے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ ذی روح جانوروں کو قتل کرنے یعنی "جیو ہتیا" کا باعث بنتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کمتر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔ غور نہیں کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے؟ آپ جب پانی پیتے ہوں گے، ایک گلاس اپنے حلق سے اتارتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبان حلق سے پیام موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو مضر جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں ان کو مار دے

کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بڑھ کر کون شخص درندگی و ظلم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ جذبات اور رویہ کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، سب ذہنی اور نا سمجھی کی بات ہے، جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو، محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کر سکتیں۔

(۱۶/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

ہڑتال ــــ اسلامی نقطۂ نظر

آج کل احتجاج اور مظاہرہ کا حق جمہوریت کی پہچان اور شناخت بن گئی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں علامتی احتجاج کیا جاتا ہے، مثلاً ایک منٹ کے لئے قلم رکھ دینا، پانچ دس منٹ کام کرنے سے باز رہنا، حکومت کو میمورنڈم پیش کرنا وغیرہ، لیکن ترقی پذیر ممالک کے لئے کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، طویل سے طویل تر مدت کا بھی احتجاج ہو سکتا ہے، احتجاج اشتعال کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، احتجاج کے نام پر پرتشدد مظاہرے کئے جاتے ہیں اور سرکاری اور عوامی املاک کی بربادی احتجاج میں کامیابی کی علامت تصور ہوتی ہے، بعض محکموں کے ملازمین مہینوں احتجاج کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، حتی کہ لازمی اور ناگزیر خدمات کے ملازمین بھی احتجاج کرنے سے نہیں چوکتے، اسپتال ہفتوں بند رہتے ہیں، پوسٹ آفس کا کام کاج ٹھپ پڑ جاتا ہے، ٹرینیں اور بسیں بند ہو جاتی ہیں، غرض کہ غریب اور پسماندہ ملکوں میں احتجاج عملاً ہر طرح کے قواعد وضوابط سے آزاد ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ٹرک کی ہڑتال ہوئی، جو ایک قیامت سے کم نہیں تھی، ضروریات زندگی کی قیمتیں جو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی ہیں، آسمان سے باتیں کرنے لگیں، بازار میں طلب اور رسد کا توازن بگڑ گیا، ملک کو اس سے جو شدید نقصان ہوا، وہ بہت ہی سنگین اور افسوس ناک ہے۔ اس ہڑتال سے پہلے بعض سرکاری ملازمین کی ہڑتال تھی اور اب خبر ہے کہ آٹو کی ہڑتال ہونے والی ہے۔ غرض ہڑتال ہماری روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں سے ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ملک کے کسی حصہ میں کوئی نہ کوئی ہڑتال نہ پائی جاتی ہو۔

ہڑتال کا اصل مقصد ظلم وناانصافی پر احتجاج کرنا ہے۔ ظلم پر احتجاج اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر ناراضگی کا اظہار یقیناً انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اسلام بھی اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا" (النساء: ۱۴۸)

"اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے،

سوائے اس کے کہ کوئی مظلوم ہو، اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظلم و ناانصافی کے خلاف مناسب طریقہ پر احتجاج و مظاہرہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں عدالت سے چارہ جوئی، احتجاجی جلسہ، پرامن احتجاجی ریلی تو شامل ہے ہی، آج کے ذرائع ابلاغ کے پس منظر میں اخبارات، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے اپنے موقف کی وضاحت اور حکومت کے نامناسب رویے سے اختلاف کا اظہار بھی اس میں داخل ہے، اسی طرح حکومت سے نمائندگی اور دوسرے قانونی ذرائع سے اپنی خفگی اور برہمی کا اظہار بھی اس میں شامل ہے۔

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے، اس کی بھی گنجائش ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچاتا رہتا ہے، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا استفسار کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں نے یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گذرنے والا کہتا اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷۵) یہ بھی گویا احتجاج کا ایک طریقہ ہے۔ فقہاء نے بیوی کو اس بات کا حق دیا ہے کہ اگر مہر فوری قابل ادا تھا اور شوہر نے ادا نہیں کیا، تو جب تک شوہر مہر ادا نہ کردے، عورت کے لئے یہ درست ہے کہ وہ شوہر کو اپنے نفس پر قدرت نہ دے، یا شوہر کے گھر نہ جائے، اس کے باوجود اس کا حق نفقہ شوہر سے متعلق رہے گا۔ یہ بھی گویا احتجاج ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کل احتجاج کی اکثر صورتیں ایسی ہیں جو بیک وقت کئی طبقوں کے لئے زحمت

نقصان اور مضرت کا باعث ہوتی ہیں، وہ دو قومی اور اجتماعی نقصان کا سبب بنتی ہیں، مثلاً کبھی گاڑی کی ہڑتال ہے، یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے، لیکن ہڑتال میں جو مزدور اور مستحقین شریک ہوتے ہیں وہ عام طور پر نہایت قلیل آمدنی کے حامل ہوتے ہیں، روز کماتے اور روز کھانے کے اصول پر ان کی زندگی گذرتی ہے، خود ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اجتماعی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتے، دوسرا نقصان کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا ہوتا ہے، مال کی پیدائش جاری رہتی ہے اور اس کی ترسیل اور فروخت رکی رہتی ہے، بعض زراعتی اشیاء تو ایسی ہوتی ہیں کہ سڑنے لگتی ہیں اور بالکل ہی ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان دونوں سے بڑھ کر نقصان عوام کا ہوتا ہے، چوں کہ بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور سامان کی رسد کم ہوجاتی ہے، اس لئے قیمتیں غیر متوازن ہوجاتی ہیں، دس روپے کی چیز سو روپے میں فروخت ہوتی ہے اور لوگ اسے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام کے نظام تجارت میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قیمتوں میں توازن کو متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی لئے "احتکار" کو منع کیا گیا۔ احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، یعنی تاجر اشیاء ضروریہ کو خرید کر روک لے، بازار میں نہ لائے، تاکہ مصنوعی قلت پیدا کی جاسکے، اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں اور دو کی چیز دس میں فروخت کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کی سخت مذمت فرمائی ہے اور شدت سے منع کیا ہے۔ اسی طرح حدیثوں میں "تلقی جلب" سے منع فرمایا گیا ہے۔ "تلقی جلب" کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں عام طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، یہی ایک مارکٹ سے دوسری مارکٹ میں سامان کے پہنچنے کا ذریعہ تھے، ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شہر کا کوئی قافلہ آنے والا ہوتا تو چند سرمایہ کار شہر سے باہر نکل کر پہلے ہی سامان خرید کر لیتے اور کھلے بازار میں سامان پہنچ نہیں پاتا، اسی طرح اشیاء ضرورت پر چند تاجروں کی اجارہ داری قائم ہوجاتی اور گرانی میں اضافہ ہوتا۔ یہ بھی ایک صورت ہے جو قیمتوں کے فطری توازن کو متاثر کرتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اسی طرح کی ایک اور صورت

بھی ہے جس سے منع فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر آتے اور جلد واپس جانا چاہتے اس لئے وہ اپنا مال جتنا سستا ہو فروخت کرتے۔ عوام کو یہ فائدہ ہوتا کہ سامان سستا ملتا اور کاشت کاروں کو یہ فائدہ ہوتا کہ درمیانی شخص اور بیچنے کے درمیان نہ ہونے کی وجہ سے ان کو پوری قیمت بلا واسطہ مل جاتی۔ شہر کے تاجروں کو یہ بات پسند نہ آتی تھی اور وہ دیہات سے مال لانے والوں کو کہتے کہ تم یہ مال ہمارے حوالہ کر دو، ہم کچھ دنوں ٹھہر کر اسے بہتر قیمت میں فروخت کر دیں گے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ قیمتوں کے فطری اتار چڑھاؤ کو روکا جائے، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، جس کو حدیث میں "بیع حاضر للبادی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان احکام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے طلب اور رسد میں توازن برقرار رکھنے اور قیمتوں میں غیر فطری اتار چڑھاؤ کو روکنے کی کیا کچھ تدبیریں کی ہیں۔ ذاتی مفادات یا کسی خاص طبقہ کی تجارتی اغراض کے سبب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں غیر متوازن ہو جاتی ہیں، جہاں سامان کی پیداوار ہوتی ہے وہاں کاشتکار اور صنعت کار کو اصل لاگت بھی حاصل نہیں ہوتی، اور دوسرے مقام پر عوام کو وہی چیز اصل قیمت سے دو چند بلکہ کئی چند قیمتوں میں خریدنا پڑتا ہے۔ یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان اور قومی خسارہ ہے۔

اس سے زیادہ نازک صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لازمی خدمات کے کسی شعبہ میں احتجاج ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال، پوسٹ آفس کی ہڑتال وغیرہ۔ ان شعبوں سے انسان کی ناگزیر ضروریات متعلق ہیں، ان سے عوام کو محروم رکھنا بہت ہی شقاوت قلبی اور ظلم کی بات ہے۔ اسلام میں انسان کی ناگزیر ضرورت کی جو اہمیت ہے، خود خدا کی عبادت اور بندگی پر بھی اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر وہ نماز نہیں توڑے گا تو کوئی شخص ڈوب جائے گا یا مر جائے گا تو نماز کو توڑنا اور اس شخص کی مدد کرنا واجب ہے، یہ ٹھیک ہے کہ یہ احکام جان اور عزت و آبرو کی حفاظت سے متعلق بھی ہیں، اس لئے ان عام لوگوں کو لازمی خدمات سے محروم کر دینا

قطعاً جائز نہیں۔

احتجاج کی جو روایت ہمارے ملک میں پڑ چکی ہے، اس میں دونوں پہلو تکلیف دہ ہیں، احتجاج کرنے والے اول تو نا روا مطالبات پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے احتجاج کے لئے تکلیف دہ اور اجتماعی سطح پر مضرت رساں طریقہ کار اختیار کرتے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ بھی نا قابل فہم ہوتا ہے، کہ حکومت صلح کرتی ہے، "لو اور دو" کی بنیاد پر معاملہ طے کرتی ہے، جیسے "بعد از خرابی بسیار"۔ اس طرح خود حکومت بھی عوام کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضرر و نقصان بہر قیمت دفع کیا جائے۔ "الضرر یزال"، نیز اسلام کی نگاہ میں ایک شخص کے نقصان کے مقابلہ ایک جماعت اور ایک طبقہ کے نقصان کے مقابلہ پوری ملت کا نقصان زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں: "اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما" (الاشباہ: ۳۴) احتجاج ایک جائز حق ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کے لئے جو صورتیں مقرر ہوں، وہ ایسا مضرت رساں نہ بن جائے کہ غریب عوام کو تنگی ہو جائے اور قوم و ملک کو اجتماعی سطح پر ضرر پہنچنے کا باعث بن جائے۔

حفاظت خود اختیاری — اسلامی نقطۂ نظر

انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس کا مالک نہیں، امین ہے، جان ہو یا مال اور عزت و آبرو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور اسے ان کا نگہبان بنایا گیا ہے، اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی ان نعمتوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ ان نعمتوں کو احکام شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کیا جائے، اور محض اپنی خواہش کو رہنما نہ بنایا جائے۔ دوسرے ان نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے، ایسی چیزوں میں خرچ کرنے سے بچا جائے جن کو شریعت نے ناپسند کیا ہے، تیسرے اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے۔

اس لئے شریعت نے خودکشی کو بھی حرام قرار دیا، کیوں کہ انسان اپنی زندگی کا امین اور محافظ ہے، اس کا کام زندگی کی حفاظت ہے، یہاں تک کہ آنحضرت، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے خودکشی کرنے والے شخص پر نماز جنازہ تک نہیں پڑھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں یہ کس قدر مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے، مالی نعمتوں کے بارے میں بھی اسی احتیاط اور قدر دانی کی تعلیم دی گئی، اگر کوئی شخص نہر کے کنارے بیٹھا ہو، تب بھی آپ نے وضو میں اسراف اور فضول خرچی کو منع فرمایا، کیوں کہ یہ تقاضۂ امانت کے خلاف ہے، اسلام امن و آشتی اور صلح و سلامتی کا نقیب ہے، لیکن اس امن کا جو سماج کے تمام افراد و اشخاص اور طبقات کو عافیت فراہم کرتا ہو، نہ یہ کہ ایک طبقہ کی بالادستی اور دوسرے کی مجبوری و لاچاری پر قائم ہو، اسی لئے اگر ایک شخص دوسرے شخص پر اور سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر زیادتی کرے، تو اسے اپنی مدافعت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ کیوں کہ یہی عدل کا تقاضہ ہے، اور حقیقی امن وہی ہے جس کی عمارت عدل و

انصاف کی مضبوط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیمات بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے بلا وجہ آمادۂ پیکار ہوں تم بھی ان سے اسی طرح مقابلہ کرو، ہاں البتہ ایسے جذباتی مواقع پر بھی انتقام کی رو میں بہہ کر ظلم و زیادتی کا راستہ اختیار نہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ بہر حال زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے: "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ"۔ (البقرۃ: ۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اسی کے بقدر اس کا جواب دو، فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (البقرۃ: ۱۹۴) یہ مدافعت، مقابلہ اور ظالم کے پنجۂ ظلم تھامنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اسی میں امن کا بقاء اور انسانیت کا تحفظ ہے، قرآن مجید نے قتل کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر کے بدلہ کا قانون مقرر کیا ہے (البقرۃ: ۱۷۸) اور اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ قاتل کو قتل کرنے میں ایک کے بعد دوسری جان کا ضیاع ہے، لیکن درحقیقت اس میں انسانی جانوں کی حفاظت اور قتل کے واقعات کا سدباب ہے۔ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ" (البقرۃ: ۱۷۹)

اگر کسی سماج میں ظلم کے لئے آگے بڑھنے والے ہاتھ ہوں، لیکن ان کو قلم کر دینے والی تلواریں نہ ہوں، لباسِ حیاء کو تار تار کر دینے والی آنکھیں ہوں، لیکن انہیں پھوڑنے والی انگلیاں نہ ہوں، بربریت کا راستہ اختیار کرنے والے قدم ہوں، اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو قید میں لانے والی زنجیریں نہ ہوں، تو وہ سماج ظلم و بربریت کی آماجگاہ بن جائے گا، اور عدل و انصاف کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے رخت سفر باندھنا ہوگا، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ سماج کے اچھے لوگ ایسے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، اور جو لوگ مشق ستم بنائے جاتے ہوں، وہ طاقت بھر اپنی مدافعت کے لئے تیار رہیں، کہ اس سے صرف ان کی شخصی حفاظت ہی متعلق نہیں، بلکہ انسانیت اور انصاف کا تحفظ متعلق ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی اختیاری عمل نہیں بلکہ ایسا کرنا اس پر شرعاً

واجب ہے۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جان، مال، مذہب، اہل وعیال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والوں کو شہید قرار دیا، حضرت سعید بن زید سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

"من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون أهله فهو شهيد" (ترمذی ۱/۲۶۱، باب ما جاء فیمن قتل دون ماله فهو شهید)

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مال ناحق لینے کی کوشش کی جائے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید ہے: "من أريد ماله بغير حق فقاتل فقتل فهو شهيد"
(ابوداؤد ۲/۶۵۵، ترمذی ۱/۲۶۱)

جان کی حفاظت تو ظاہر ہے، مال کی حفاظت میں یقیناً دوکان، کاروبار، سواری وغیرہ کی حفاظت شامل ہے، دین کی حفاظت میں مساجد و مدارس، خانقاہیں، مسلمانوں کے مقابر، مسلمانوں کے مذہبی پیشوا سب شامل ہیں، کیوں کہ یہ سب شعائر دین کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان سب کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے، اور اگر ان کی حفاظت و حمایت میں کسی مسلمان کی جان جاتی ہے تو یقیناً وہ شہید ہے، اہل وعیال کی حفاظت میں ان کے جان و مال کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت بھی شامل ہے، کیوں کہ عزت و آبرو کی اہمیت انسان کے حق میں اس کی جان اور زندگی سے کم نہیں، بلکہ ایک غیرت مند انسان کے لئے بعض اوقات جان کا دینا، عزت و آبرو کی پامالی کو قبول کرنے

سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

تحمل و برد باری اچھی چیز ہے۔ بزدلی اور خوف بری اور گھٹیا چیز، کسی بھی قوم میں بزدلی کا پیدا ہو جانا ایک ایسا مرض ہے جو اس کو میدان عمل میں تنگ داماں کر دیتا ہے، شجاعت و بہادری، بلند حوصلگی، قوت ارادی کسی بھی زندہ قوم کے لئے ضروری وصف ہے، مسلمان مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں، انہیں موجودہ حالات میں سب سے زیادہ ماتم تاتاری فتنہ کا کیا جاتا ہے، تاتاریوں کے حملے نے مسلمانوں کو صرف پسپائی ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو کم ہمت اور پست حوصلہ کر کے بھی رکھ دیا تھا، وہ نوبت یہ تھی کہ ایک ایک تاتاری عورت بیسیوں مسلمان مردوں کو کھڑا کر دیتی اور اپنے گھر سے ہتھیار لے کر آتی، پھر باری باری ذبح کرتی، اور یہ مسلمان نہایت بزدلی اور دون ہمتی کے ساتھ قتل ہوتے رہتے اور مدافعت کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

اسی حق مدافعت کا نام "حفاظت خود اختیاری" ہے۔ جسے دنیا کے تمام مذاہب اور جدید و قدیم نظامہائے قانون میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد ظلم کو روکنا اور امن کو پائیدار بنانا ہے، نہ کہ امن کو پارہ پارہ کرنا اور دوسروں پر ظلم و جور کو روا رکھنا، حفاظت خود اختیاری کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہو تو ہم قصور وار و بے قصور اور مجرم و بے گناہ میں فرق کئے بغیر اس قوم کے لوگوں پر حملہ بول دیں، اور قتل و غارت گری مچائیں، اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اگر کچھ لوگوں نے بد ترین خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں کو بے آبرو کیا ہو تو مسلمان بھی ایسے ہی ناشائستہ اور غیر شریفانہ حرکت پر اتر آئیں، یہ اسی "اعتداء" یعنی حد سے گزر جانا ہے، جس کو قرآن مجید نے منع کیا ہے، لیکن جو لوگ واقعی مجرم اور قصور وار ہوں، ان سے اپنی حفاظت اور ان کے خلاف مناسب ردعمل ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، جس سے پہلو تہی کسی طور مناسب نہیں۔

حفاظت خود اختیاری کے تقاضے: یہ ہیں، اول خود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ اچانک حملوں کا مقابلہ کر سکیں، اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت کے

اسباب مہیا رکھنا ہی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جن سے جسم میں توانائی پیدا ہو، چنانچہ آپ نے کشتی، دوڑ، گھوڑ سواری وغیرہ کو پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے، المومن القوی خیر من المومن الضعیف ۔ رسول اللہ ﷺ اسباب حفاظت کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ استنجا کے لئے تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا تاکہ کیڑے مکوڑوں سے حفاظت ہو سکے، یہ مکان کہ گھر میں سانپ مارنے اور کتوں کو بھگانے کے لئے لاٹھی تک میسر نہ ہو نہایت ہی غیر دانشمندانہ بات ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جو کچھ ہو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہو۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمان اپنے محلہ میں اجتماعی مدافعت اور حفاظت کا ماحول بنائیں، یعنی اگر کسی بے قصور شخص پر حملہ ہو یا محلہ کے کسی مکان پر یلغار ہو جائے تو تمام لوگ جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کریں، ہر شخص اس کو اپنے آپ پر حملہ تصور کرے اور مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو، یہ بات کہ ہر آدمی اپنی باری کا انتظار کرے اور یکے بعد دیگرے خود سپردگی اختیار کرتا جائے، غیر دانشمندانہ، خود غرضی اور ہلاکت خیز بزدلی بلکہ خودکشی ہے، اجتماعی قوت موثر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شریک حال رہتی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہے یہد اللہ علی الجماعۃ، البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسی اجتماعیت کی قیادت صالح، سنجیدہ اور دور اندیش لوگوں کے ہاتھوں ہو، جو کہ شر پسند، بدمعاش اور مشتعل مزاج لوگوں کے ہاتھ میں، کہ ایسی صورت میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

حفاظت کا تعلق آبادیوں کی ہیئت سے بھی ہے، جہاں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول ہو، اور مفسد مزاج لوگ امن کو درہم برہم کرنے کے درپے رہتے ہوں، وہاں خاص کر مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان آباد ہونا اور مسلم آبادی کے جزیرے بنانا ضروری ہے، اس سے وہ اپنی جان و مال، کاروبار اور عزت و آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ اپنے عقیدہ و ایمان اور تہذیب و ثقافت کی بھی حفاظت کر سکیں گے، اسی لئے حضرات

انبیاء کو اپنے شہروں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، جہاں اہلِ حق سے عداوت و عناد رکھنے والوں کا غلبہ ہوا اور اہلِ ایمان کو اپنی بستی بسانے کی تلقین کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو مشرکین کے ساتھ اپنا مسکن بنائے رکھے میں اس سے بری ہوں۔

حفاظت کا تعلق قانون و آئین سے بھی ہے، یہ بدبختی ہے کہ قانونی پیشہ اختیار کرنے کا رجحان مسلمانوں میں کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر قانون فہمی کا شعور پیدا کریں، کون سے جرم پر کون سی دفعہ عائد ہوتی ہے، کس دفعہ کے تحت اپنا مقدمہ درج کرایا جائے؟ پولیس میں فرقہ پرست عناصر جو کیس بناتے ہیں اور مقدمہ کو کمزور کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کرتے ہیں، اور شہادتوں کو کس طرح کمزور کرتے ہیں؟ مسلمانوں کو اس سے آگاہ ہونا چاہئے۔ یہ نا آگہی مجرموں کی جرأت بڑھاتی اور مظلوموں کی بے بسی میں اضافہ کرتی ہے۔

حفاظت کا تعلق قیادت سے بھی ہے، اس بدبختی پر جس قدر رویا جائے کم ہے کہ مسلمان نہایت تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے باوجود اپنے مشترک مسائل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا نہیں چاہتے، اشتراک اور اجتماعیت سے قیادتیں بنتی اور ابھرتی ہیں، اسی لئے حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ قیادت سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت وفرمانبرداری سے قیادت طاقتور ہوتی ہے "لا جماعة الا بامارة و لا امارة الا بطاعة" جب آپ کا ایک یا ایک سے زیادہ لیڈر ہو یا کوئی مشترک پلیٹ فارم ہو، اور اس کے ساتھ پوری قوم کا اعتماد اور تائید و تقویت ہو تو اس سے اس قیادت کا وزن حکومت میں اور دوسری قوموں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، اس کی بات سنی جاتی ہے، اس کی رائے کو وزن دیا جاتا ہے، اور اس کی آواز کی قوت محسوس کی جاتی ہے، گجرات کے فسادات نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہاں مسلمان قیادت کے فقدان کی وجہ سے فرقہ پرست حکومت اور پولیس نے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد سمجھا اور اس نے جواب دہی کے تصور سے خالی اور بے پرواہ ہو کر مظالم ڈھائے، اگر ذرائع ابلاغ نے ان کے ان مظالم کو آشکارا نہ کیا ہوتا تو

مرض اور مریض ـــــ اسلامی تصور

ابھی گذشتہ ہفتہ ہم نے عالمی یومِ صحت منایا ہے، بے شک صحت سے بڑھ کر زندگی کوئی نعمت نہیں اور بیماری سے بڑھ کر شاید کوئی آزمائش نہیں، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور انسانی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک مشغول آدمی کو مایوس، رنجیدہ اور ناہموار مزاج مریض کی عیادت و تیمارداری پر آمادہ کر سکے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ ان میں آپ ﷺ نے مریض کی عیادت کا بھی ذکر فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک انسان کسی مریض کی عیادت میں مصروف رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغیچوں میں رہتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن انسان سے دریافت فرمائیں گے کہ اے فرزندِ آدم! میں بیمار تھا اور تم نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان کہے گا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ بھی بیمار اور عیادت کے محتاج ہوتے ہیں؟ ارشادِ باری ہوگا کہ اگر تم فلاں مریض کے پاس پہنچتے اور اس کی عیادت کرتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔

آپ ﷺ نے عیادت کو ایک انسانی فریضہ قرار دیا ہے، اس لئے اس میں مسلمان اور غیر مسلم، بڑے چھوٹے، مالدار اور غریب کا کوئی فرق نہیں، آپ ﷺ نے یہودی کی بھی عیادت کی ہے اور مشرک کی بھی عیادت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ اگر کسی علاقہ میں وبائی مرض پھوٹ پڑے تو وہاں سے لوگ بھاگ کھڑے ہوں۔ کیونکہ ایک تو بھاگنے والوں کے ذریعہ مرض کے جراثیم دوسرے علاقوں تک بھی پھیل جائیں گے۔ دوسرے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جو لوگ مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے لئے تیماردار اور دیکھ ریکھ کرنے والے نہیں رہیں گے۔ قرآن مجید نے بیماروں کے لئے خصوصی مراعات دی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: "ولا علی المریض حرج" (النور: ۶۱) ایک موقع پر قرآن

نے ان میں طرح "نابینا" اور "لنگڑے" کا ذکر کیا کہ ان پر کوئی حرج نہیں: لیس علی
الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج (الفتح: ۱۷)۔

بعض مذاہب میں بیماری کو پاپ کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو بھائیوں کے
یہاں آواگون کا نظریہ ہے، اس نظریہ کے تحت انسان اس جنم میں جو کچھ تکلیف اٹھاتا ہے
وہ پچھلے جنم کے گناہوں کا اثر ہے، اس سے مریض سے بجائے ہمدردی، محبت و خیر خواہی اور رحم
دلی کے بجائے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے، اسلام نے بتایا کہ بیماری اللہ کی طرف سے
آزمائش اور امتحان ہے، ضروری نہیں کہ گنہگار ہی بیمار پڑے، اللہ کے نیک بندے بھی بیمار
ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بیماری سے انبیاء و رسل بھی دوچار ہوتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ
صالحین و اللہ کے نیک بندوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے انسانی زندگی کے امانت خداوندی ہونے کا تصور پیش کیا، اس لئے
آپ ﷺ نے خودکشی کو حرام اور سخت گناہ قرار دیا۔ آج تو عدالتیں بھی خودکشی کی اجازت
دینے کو آمادہ ہیں، لیکن اسلامی ہی نہیں، اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک سانحہ کا
درجہ رکھتا ہے، اسلام نے اس وقت سے انسان کا تحفظ کیا ہے جب کہ وہ ابھی عالم رنگ و بو
میں آیا بھی نہ ہو، نئی دنیا نے معاشی مقصد کے تحت اسقاط حمل کو جائز کیا، آپ ﷺ نے
انسانی آبادی کی افزائش کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، معاشی اندیشوں کے تحت آبادی کی
روک تھام کا تصور بھی نیا نہیں ہے، اسلام سے پہلے بھی عربوں کے یہاں ایسا تصور موجود
تھا، قرآن مجید نے اس کی مذمت کی اور فرمایا گیا کہ بھوک اور فقر کے خوف سے اپنی اولاد
کو قتل نہ کرو: ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق (بنی اسرائیل: ۳۱) تحدید نسل کے
پیچھے جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ غذائی وسائل محدود ہیں، اگر انسانی آبادی غیر
محدود طور پر بڑھتی چلی جائے تو انسان کے لئے بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی ممکن نہیں
رہے گی، لیکن یہ محض اندیشہ ہائے دور دراز کا درجہ رکھتا ہے اور حالات نے اس کی غلطی کو
اظہر من الشمس کر دیا ہے، تحدید نسل کے نظریہ کے بانی مالتھس کی پیشین گوئی کے مطابق
آج لوگوں کو بھوکے مرنا چاہئے تھا، لیکن ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ غذائی،

میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ جس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، آپ ﷺ نے غیبت کے سلسلہ میں جو اصول بتائے ہیں وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ غیبت انسان کے جسمانی، فکری یا اخلاقی و عملی عیب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کا نام ہے، یہ حرام و گناہ ہے، آپ ﷺ نے اس سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ معالجین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ایسے امراض کے معاملہ میں امانت کا ثبوت دیں اور پردہ پوشی سے کام لیں، جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو، البتہ اگر کسی شخص کو نقصان اور دھوکہ سے بچانا اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس شخص کی حد تک مرض کا افشاء جائز ہے، خود آپ ﷺ سے ایسے شخص کے سامنے عیب کا اظہار ثابت ہے جو اس سے رشتہ کرنا چاہتا ہو، یہی اسلام کا توازن و اعتدال اور اس کا اصل امتیاز ہے۔

(۱۲ اپریل ۱۹۹۹ء)

ایڈز —— حقیقی حل کیا ہے؟

کل ۱ر دسمبر کی تاریخ تھی، اس تاریخ کو بین الاقوامی سطح پر ایڈز کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ایڈز ایک ایسی بیماری کی حیثیت سے ہمارے سماج میں معروف ہے کہ جس سے لوگ شاید درندہ جانور سے بھی زیادہ خوف کھاتے ہوں، کہا جاتا ہے کہ اس کے جراثیم کا اولین پتہ پہلی بار ۱۹۸۳ء میں فرانس میں ہوا، ابتداءً یہ مرض ان لوگوں میں پایا گیا جو ہم جنسی جیسی بدترین برائی میں مبتلا تھے، اس مرض کی شناخت میں کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے مرض کی دریافت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے، ہندوستان میں پہلی دفعہ اس کا مریض ۱۹۸۶ء مدراس میں دریافت ہوا، یہ مرض ایک ہولناک سیلاب کی طرح بڑھتا جارہا ہے، دسمبر ۱۹۸۳ء میں عالمی تنظیم صحت کا اندازہ تھا کہ ایک کروڑ بیس لاکھ افراد اور دس لاکھ بچے ایڈز کے جراثیم کے حامل ہیں، روزانہ پانچ ہزار نئے انفیکشن زدہ افراد وجود میں آتے ہیں اور ہر اٹھارہ سکنڈ میں ایک نیا فرد انفیکشن سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۹۹۳ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں سرکاری حاصل شدہ رپورٹ میں گیارہ ہزار افراد اس مرض سے متاثر تھے، لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے بموجب غیر دریافت شدہ افراد کو لے کر ان کی تعداد گیارہ لاکھ سے کم نہ تھی، ہندوستان میں مہاراشٹر، دہلی اور تمل ناڈو میں متاثرین کا اوسط سب سے زیادہ ہے، سروے اور اعداد وشمار کے ذریعہ یہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طبقہ میں اس کا کیا اثر ہے؟ چنانچہ اس مرض کے جراثیم ۱۵ فیصد طوائف میں، ۵ تا ۷ فیصد ان سے اختلاط رکھنے والوں میں، ۲۰ فیصد ہم جنسی سے ملوث مردوں میں اور ۵۰ فیصد ڈرگس استعمال کرنے والے مردوں میں، اور دوسرے طبقوں میں اس سے کم پائے گئے ہیں، بنیادی طور پر ۳۱ فیصد سے زیادہ غیر قانونی

اور غیر فطری جنسی تعلقات اس کا سبب بنتا ہے۔ اور تقاضۂ فصد سے زیادہ خون کی منتقلی نے اس مرض کو متعدی بنا دیا ہے، یہ بھی گویا بالواسطہ اصل مریضوں ہی سے متعدی ہو کر مرض کے پھیلنے کی صورت ہے، یہ ایک ایسی متعدی کی صورت حال ہے جو یقیناً کسی سمندری طوفان سے کم نہیں ہے والا نہیں۔ ابتداءً اس مرض کا غلبہ مغربی ممالک میں تھا، لیکن اب مشرقی ممالک میں بھی اس عفریت نے اپنی جگہ بنا لی ہے، بالخصوص بہار، اڑیسہ اور تمل ناڈو میں جسم فروشی اور منی پور، میزورم اور ناگالینڈ میں انٹروینس ڈرگ کی وجہ سے یہ بیماری نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اس مرض کی پیدائش تو غیر اخلاقی راہ روی کی وجہ سے ہوتی ہے، لیکن آگے یہ مرض مختلف اسباب کے تحت متعدی اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔ خون کی منتقلی سے، اعضاء کی پیوند کاری سے، اس مریض کے جسم میں لگائی گئی سوئی کے استعمال سے، بعض اوقات استرے اور بلیڈ سے، مادہ منویہ کی مصنوعی تخم کاری سے، شوہر و بیوی کو ایک دوسرے سے، مریضہ ایڈز کے بچہ میں موروثی طور پر، یہاں تک کہ اگر موت کے بعد لاش کو مردہ خانہ میں رکھا جائے تو لاش میں بھی ایک ہفتہ تک یہ جراثیم موجود ہوتے ہیں، اس لئے ایڈز سے مرنے والوں کو پلاسٹک کی دو چادروں کے درمیان اس طرح لپیٹنے کی ہدایت دی جاتی ہے کہ دونوں کے درمیان ہوا، پانی اور چیونٹی کا گذر نہ ہو۔

ایڈز نے اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سے فقہی سوالات کو بھی ابھارا ہے، مثلاً یہ کہ جو شخص ایڈز کا مریض ہو، اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے متعلقین کو اس سے مطلع کر دے اور انتقال مرض کے اسباب سے بچے اور بچائے، یا عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرے؟ ایڈز کے مریض کے بارے میں معالج کا فریضہ کیا ہے؟ مریض کے راز کی حفاظت معالج کا فریضہ منصبی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس مریض کے راز کو چھپائے رکھے، دوسری طرف اگر اس میں پردہ داری کی جائے تو بہت سے لوگوں کو اور سماج کو اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اجتماعی نقصان انفرادی نقصان سے بہرحال اہم ہے، پھر ایسے مریضوں کے بارے میں خود سماج کی کیا ذمہ داری ہے؟ تیمارداری

دیکھی۔ مذہبی اور عوامی تقریبات میں ایسے مریضوں کی شرکت کا کیا حکم ہوگا؟ کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہاسٹل بنادیئے جائیں، جیسا کہ بعض فقہاء نے کوڑھ کے مریضوں کے لئے ہاسٹل کا مشورہ دیا ہے (فتح الباری ۱۰؍۱۶۱)؟ اگر ایڈز کا مریض قصداً کسی اور کو بیماری منتقل کرے تو کیا اس پر تاوان واجب ہوگا؟ شوہر کو ایڈز ہو تو کیا بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ ایڈز زدہ عورت کا حمل ساقط کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو بچے اس مرض میں مبتلا ہوں، ان کی تعلیم وتربیت کیوں کر انجام پائے اور کیا ایڈز کے احکام وہی ہیں جو مرض وفات کے ہیں؟ یہ نہایت اہم فقہی سوالات ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہیں، راقم الحروف نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' (مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند) میں ان سوالات پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

لیکن یہ سوالات ان لوگوں سے متعلق ہیں جو خدانخواستہ اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، جو لوگ محفوظ ہوں، ان کے لئے ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا، کیوں کہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اور اس کے امانت ہونے کا تقاضا ہے کہ ایسے اسباب وعوامل سے بچا جائے جو جسم کو نقصان پہنچائیں یا اس کی ہلاکت و بیماری کا باعث بنیں، سب سے پہلی احتیاط تو ظاہر ہے کہ بے حیائی سے باز رہنا ہے، اسلام میں جس قدر سخت سزا ''زنا'' کی رکھی گئی ہے، شاید کسی اور کی بھی نہیں رکھی گئی، شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے، اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے لگائے جائیں، دوسری سزا کا ذکر قرآن میں ہے (النور: ۲) اور پہلی سزا بکثرت احادیث میں مذکور ہیں، اور خلافت راشدہ سے آخری اسلامی عہد حکومت تک اس کا تعامل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زنا سے بچو کہ اس سے چار باتیں ہوتی ہیں: چہرے سے رونق کا ختم ہو جانا، رزق کی تنگی، اللہ کی ناراضگی اور جہنم کی ہمیشگی۔ (مجمع الزوائد عن ابن عباس: ۶؍۲۵۵) یہ بات قابل توجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زنا کی وجہ سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں، وہ چہرہ اور جسم کو بدہیئت بنادیتے ہیں، جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حدیثوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو دنیا میں بھی

جنس کی سوغات مغرب سے آئی ہوئی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک میں (اور کم و بیش یہی حال پوری دنیا میں ہے) ایڈز کو روکنے کی مہم چلائی جا رہی ہے، لیکن دوسری طرف ایڈز کے محرکات اور اصل اسباب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں ہے، زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بدکاری کو "صحبت" کا نام دیا جاتا ہے، اختلاطی مباشرت کو دقیانوسیت کہا جاتا ہے، بعض ملکوں میں ہم جنسی بلکہ ہم جنس شادی کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے، اخبارات میں اشتہارات اس بات کے نکلتے ہیں کہ لوگ غیر قانونی جنسی اتصال سے بچیں، بلکہ ترغیب دی جاتی ہے کہ محفوظ طریقے اختیار کئے جائیں، فحشیات کا بازار گرم ہے، اس پر نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے، اور بے حسی کی آخری حد ہے کہ خدا کا خوف تو گناہوں سے باز رکھنے میں موثر تھا ہی نہیں، لیکن اب خدا کی کھلی ہوئی تنبیہ اور آنکھوں دیکھی مضرت و ہلاکت بھی آنکھیں کھولنے سے قاصر رہ جائے، اور اب بھی انسان گناہ کے دلدل سے باہر نکلنے بلکہ گناہ سے بچنے کے بجائے گناہ کے محفوظ طریقے تلاش کرے۔

(۳ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

حق آزادی اور اس کی حدیں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن انتقال و حرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس و شعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور و احساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل و حرکت کی قوت ہے — جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کردئے جائیں نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگادیں، انھیں کوئی اعتراض نہیں، اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی آقا مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ اس سے مختلف ہے، ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک، اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق دفاع کریں گے اور فرار اختیار کرنے سے بچنے کی کوشش کریں گے، اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور اور فہم و ادراک کی اعلیٰ صلاحیت ودیعت کی ہے، کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سواں حصہ بھی حاصل نہ ہو،

اس لئے انسان میں آزاد رہنے کا جذبہ زیادہ ہے، اور اس کی فطرت غلامی سے اباء کرتی ہے، انسان کے تو معصوم و شیر خوار بچے کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضروری احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے، اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں رہ سکتا، اور مزاج و مذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار سے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون و طمانیت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، اور وہ تعلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظام حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانون فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو عالم اسلام کے سفیر صحابی رسول ﷺ نے رستم ایران کے دربار میں کہے تھے، اور ان پر اپنا مقصد و منشا واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة اللہ۔ (البدایہ والنہایہ ج۷ ص۳۹)

انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کو فرمایا کہ ان کو ان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا، تم نے ان کو کب سے غلام بنا لیا ہے، یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان و اظہار ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، اس لئے آزادی ایک انسانی اور اسلامی حق ہے۔

آزادی کے تصور کو طاقت پہونچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا، کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، شکل، رنگ، نسل، خاندان، نسب اور علاقہ و وطن کی بنیاد پر ان میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں، برتری اور

تجربی انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے۔ اب ذکر ہو ایک اور عقیدہ کا: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۱۳) یہ وہ بنیادی تصور ہے جس نے بعد کو انسان کا پیدائشی طور پر حکمران اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار دیا ہے۔ اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہت قائم تھی، روم، ایران، حبش، یمن، ہندوستان، غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کو حکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا، ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا پرتو تصور کرتے تھے، مغرب میں پاپائیت نے انسان کو اپنا مکمل غلام بنا لیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کو لوگوں کی آخرت کا ٹھیکیدار تصور کرتے تھے، بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کو خدائی فیصلہ باور کراتے تھے، اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کر دیا گیا تھا، ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اور لوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے، اور دوسری طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر نہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے، اور جو ان کی رائے سے سرمو انحراف کرتا ان کو ایذا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا، اور زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی، بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس پر یہ پاپائی نظام یورپ سے ختم ہوا، گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی، اسی لئے یورپ میں جو انقلابی تحریکیں اٹھیں ان کا خمیر مذہب کی مخالفت اور عداوت سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کو یکسر ختم کر دیا، اور ایک ایسے آزادانہ طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا، جس میں رنگ و نسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پر فرمانرواؤں کا انتخاب عمل میں آئے، اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ حکمران کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے، اس کے فیصلے خطا بھی ہو سکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی، اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حقِ حکمرانی "نسل" سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہو جائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے، بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور انتساب

سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور ابھرتا ہے، اور تباہی کی نفی ہوتی ہے۔

پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے، اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کر دیا جائے تو اس کے وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء: ۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (نساء: ۲۹) —— پھر کسب معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آ رہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے۔ ہاں، اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جا سکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت و آبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے، اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے، لا یسخر قوم من قوم (الحجرات: ۱۱)۔ عدل و انصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے، اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران و محکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ بے لاگ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے، ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا (المائدہ: ۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطا کی گئی، اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران: ۱۰۴)۔ ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے، لا یحب اللہ الجہر

اخلاقی قدروں کو بھی تنگ نظری کی علامت سمجھ لیا گیا، مغرب اخلاق سے بھی آزادی کا پروانہ دے دیا گیا، اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہوگئی کہ وہ اپنے پیکرِ آزادی پر اخلاق و شرافت کی قید و بند کا کوئی تار لباس بھی باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام و تدبیر انسان کے ہاتھ میں رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف: ۴۰) کیونکہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کے حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی۔ یہ آزادی کا ایک متوازن معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے، بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بننا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی تو قبول کرنی ہوگی، اسی کو حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبال نے کہا ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۵؍ اگست ۲۰۰۱ء)

آزادیٔ تحریر یا آوارہ خیالی؟

خشونت سنگھ ہمارے ملک کے معروف اور کہنہ مشق صحافیوں میں ہیں، دلچسپ ہوا طنز اور مخاطب کو مشتعل کر دینے والی تحریر یعنی اگر فن کا کمال ہو تو اس کمال میں کم اہل قلم ہیں جو ان کی ہمسری کر سکیں، لیکن آزاد خیالی بلکہ آوارہ خیالی کی وجہ سے ان کی تحریریں اکثر نزاع کا باعث بنی رہتی ہیں، انسان کی عملی اور فکری وابستگی کے جتنے مرکز ہیں ان میں سب سے زیادہ مقدس مذہبی وابستگی ہے۔ ہر شخص اپنے دین و حرم کے مقابلہ میں بہت جذباتی اور حساس ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سلیم الفکر معاشرہ ایک دوسرے کے مذہبی احساسات کے احترام اور رعایت پر مبنی ہے۔ خشونت سنگھ چونکہ دہریہ ہیں، اور فکری اعتبار سے مادر پدر آزاد ہیں، اس لئے شرافت اور انسانیت کے اس عمومی احساس سے بھی محروم ہیں، اس لئے اپنے قلم زد سے بھی ان کو گھائل کرتے رہتے ہیں، کبھی ہندو ان کا نشانہ بنتے ہیں، کبھی سکھ اور کبھی مسلمان، کبھی کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو ہدف بناتے ہیں یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے، لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں۔ آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں، لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہرحال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑیں اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کر دے، اس کا نام آزادی نہیں بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے، افسوس کہ خشونت سنگھ جس آزادی صحافت کے علمبردار اور حریت فکر کے دعویدار ہیں، وہ کسی قسم کی اصول و قواعد اور شرافت و سنجیدگی سے آزاد صحافت ہے۔

ابھی حال ہی ان کا ایک ناول THe Company of Woman یعنی عورتوں کی صحبت، کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نام سے ہی بے حیائی اور بے شرمی جھلکتی ہے، قارئین اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی بیہودہ قسم کا ناول ہے۔ اس میں مرد و عورت کے شہوانی جذبات، شہوانی افعال یہاں تک کہ جسم کے مستور اعضاء کی بھی بہت بے حجابانہ تصویر کشی کی گئی ہے، ہمارے ملک میں انڈین اسٹیج اس قسم کی تحریروں کی تشہیر و اشاعت کے لئے معروف ہے، اسی نے اس ناول کا خلاصہ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۹ء کو شائع کیا ہے۔ اس فرضی کہانی میں پاکستان کی ایک مسلم خاتون اور ہندوستان کے ایک غیر مسلم نوجوان کا بنیادی کردار ہے۔ اس میں اس عورت کی زبان سے ہندو مذہب کے متعدد اخلاقی پہلوؤں کو سوالات کے ذریعہ ابھارا گیا ہے، جو یقیناً ہندو بھائیوں کے لئے ایک تکلیف دہ بات ہے، پھر اسلام پر کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں، حجر اسود کے بوسہ لینے کو بت پرستی کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ پھر یہ فحش منظر بھی پیش کیا گیا ہے کہ کہانی کے یہ دونوں کردار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور بدکرداری کرتے ہیں، اور اس برائی کے درمیان وہ عورت اپنے گلے میں آیات قرآنی کا نکلس لٹکائے رہتی ہے، اور یہ عورت کہتی ہے کہ وہ عمرہ کر کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرے گی، یہ بات بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ وہ پابند نماز عورت ہے۔

ان مضامین کی بیہودگی اور ناشائستگی ظاہر ہے کہ اس میں ہندو مذہب کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے، اور مسلمانوں کے جذبات کو تو بہت ہی ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ عمرہ جیسی عبادت کا تمسخر اور ایک پابند نماز خاتون کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ ایک کہنہ مشق، جہاں دیدہ اور معروف صحافی سے ایسی اوچھی حرکت کا صدور اور ایسی ناپاک تحریروں کی تخلیق نہ صرف خشونت سنگھ کے لئے شرمناک ہے بلکہ اس سے تمام ہندوستانیوں کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے کہ ہندوستان کی شرم و حیا، اور عفت و عصمت ضرب المثل رہی ہے۔ جو ملک سیتا کی عفت و پاک دامنی کا امین ہو وہاں ایسی شہوت انگیز فرضی کہانیاں اور مخرب اخلاق ناول لکھے جائیں تو اس سے زیادہ قابل افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

ووٹ ــــــ اسلامی نقطۂ نظر

ملک میں الیکشن کا عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ علاقوں میں لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کر چکے ہیں، اور ہمارے شہر میں کل لوگ اپنے اس حق کو استعمال کریں گے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم انتخاب اور رائے دہی کے اس عمل کے بارے میں اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر جاننے کی کوشش کریں، کیونکہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی وضاحت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ووٹ کے بارے میں بھی اسلام کے اصولی احکام سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے، جب کوئی شخص انتخاب میں امیدوار بنتا ہے تو وہ بنیادی طور پر دو باتوں کا دعویٰ کرتا ہے، اول اپنی امانت و دیانت کا، دوسرے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب حکومت مصر کے سامنے بار قیادت اٹھانے کی پیشکش کی تھی تو فرمایا تھا: اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (یوسف: ۵۵) یعنی خزانے کے انتظام اور انصرام پر مجھے مامور کیجئے، کیونکہ میں نگہبان ہوں اور آگاہ ہوں، حفاظت و نگہبانی اسی شخص سے ممکن ہے جو دیانت دار اور امین بھی ہو، جو شخص خود ہی خیانت اور بددیانتی کا مرتکب ہو وہ کیا حفاظت اور نگرانی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے؟ اور علم سے اشارہ صلاحیت اور اہلیت کی طرف ہے، جب تک کسی معاملے سے متعلق علم و آگہی نہ ہو، انسان اس کے انتظام و انصرام اور اس سلسلہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنا اپنے متعلق امانت دار اور باصلاحیت ہونے کا دعویٰ ہے۔

ووٹ دراصل ووٹروں کی طرف سے اس کے اس دعوے کی تصدیق اور اس کے راست گو ہونے کی گواہی ہے، گویا آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، اس کے حق میں

گواہی دیتے ہیں کہ جتنے امیدوار اس حلقہ سے کھڑے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ
دیانت دار اور باصلاحیت ہے، اور معلوم ہے کہ جہاں سچی گواہی دینا ان کے لئے اجر و
ثواب کا موجب ہے، جھوٹی گواہی اسی قدر عذاب و عقاب کا سبب ہے، رسول اللہ ﷺ نے
جھوٹ اور جھوٹی گواہی کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کے
بعد تین بار ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے: "عدلت
شهادة الزور بالاشراك بالله" پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: فاجتنبوا
الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (؟) یعنی بت پرستی کی نجاست اور جھوٹی
بات کہنے سے بچو (ابوداؤد، حدیث نمبر ۳۵۹۹، ترمذی، حدیث نمبر ۲۳۰۰) اللہ تعالیٰ نے
مومن کے خاص اوصاف میں سے اس بات کو بھی قرار دیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتا
(الفرقان: ۷۲) لہٰذا کسی امیدوار کو نامناسب جانتے ہوئے پھر بھی اس کے حق میں ووٹ
دینا گویا جھوٹی گواہی دینا اور ناحق اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ سے دوچار کرنا ہے۔

جہاں جھوٹی گواہی دینا گناہ ہے، وہیں ضرورت کے باوجود گواہی نہ دینا "کتمانِ
شہادت" ہے اور یہ بھی سخت گناہ ہے، قرآن مجید نے گواہی کے چھپانے کی سخت مذمت کی
ہے، ارشاد ہے: لا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه آثم قلبه (البقرة: ۲۸۳) کہ
گواہی کو چھپایا نہ کرو، جو گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ اس لئے ہندوستان کے
موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ووٹ دینا شرعاً واجب ہے، اور کسی شدید ضرورت کے
پیش آئے یا عذر شرعی کے بغیر ووٹ دینے سے پہلو تہی کرنا گناہ کا باعث ہو سکتا
ہے، اور عنداللہ اس پر گرفت و مواخذہ کا اندیشہ ہے۔

بعض حضرات پیسے لے کر کسی امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں،
یہ بھی گناہ اور جرم ہے، کیوں کہ پیسہ لے کر کسی شخص کے حق میں جھوٹی گواہی دینا ہے،
اور ظاہر ہے کہ یہ رشوت ہے، اور رشوت کتنا سخت گناہ ہے اور کس قدر معصیت ہے؟ یہ
کسی مسلمان سے محتاج اظہار نہیں، رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت
لینے والے پر لعنت بھیجی ہے، ایک حدیث شریف میں ہے کہ رشوت دینے والے اور

رشوت لینے والے دونوں دوزخی ہیں، چند پیسوں کے لئے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی لعنت کا مستحق بنا لینا اور دوزخ خریدنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک کے قانون کے تحت عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، مسلمان خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق سے فائدہ اٹھائیں، اسلامی نقطۂ نظر سے عورت الیکشن میں امیدوار نہیں ہو سکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی امیدوار بنائیں، تاہم عورت کے ووٹ دینے میں کچھ حرج نہیں، فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ گواہوں کے تزکیہ کا آتا ہے، یعنی جو گواہان عدالت میں پیش ہوئے ہوں ان کے بارے میں معتبر اور نامعتبر ہونے کی گواہی، اور اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی کو معتبر مانا گیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **ویقبل تعدیل المرأة لزوجها و غیره اذا کانت امرأة برزة تخالط الناس و تعاملهم** (ہندیہ ۳/ ۵۲۸) ووٹ بھی اسی قبیل سے ہے۔

ووٹ میں شفاعت و سفارش کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، جب آپ کسی کو ووٹ دیتے ہیں تو گویا اس کے حق میں سفارش کرتے ہیں کہ اسے قوم و ملک کے انتظامی امور میں نمائندہ بنایا جائے، اور شفاعت و سفارش اگر درست ہو تو باعث اجر و ثواب ہے، اور غلط سفارش کی جائے تو سفارش کنندہ بھی گناہ میں حصہ دار ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بہتر سفارش کرے گا، اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا اور جو نادرست سفارش کرے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (النساء: ۸۵) غلط سفارش کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت اسامہ ؓ نے چوری کے ایک مقدمہ میں مجرم کے لئے سفارش کی، تو آپ ﷺ اتنے برہم ہوئے کہ کھڑے ہو کر اس پر مستقل خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی لئے ہلاک ہو گئے کہ جب کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور کوئی معمولی شخص چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۷۳)۔ اس لئے غلط سفارش بھی نہایت ہی مذموم عمل ہے، اور چوں کہ ووٹ کے

ووٹ ــــــ ایک امانت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لئے آزادی اس کی فطرت میں ہے۔ غلامی اس کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خواہ اس غلامی کے ساتھ اس کی جسمانی راحت کا کتنا بھی سروسامان کیا جائے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے کسی پرندہ کو سونے کے قفس میں بند کر دیا جائے۔ اس آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے جہاد کیا اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا، آج ہمارا ملک آزاد ہے، ہم خود اس کے دروبست کے مالک ہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلہ میں شریک ہیں۔ یہ آزادی اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ ہم آزادانہ اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، ہم جس بات کو غلط سمجھیں اسے برملا غلط کہہ سکتے ہیں، ہم ان لوگوں کا احتساب کر سکتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں متمکن ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور محرومانِ ہدایت کو سچائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

اس جمہوریت کا ایک حصہ "الیکشن" ہے، جس میں ملک کے عوام اپنے لئے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرتے ہیں، جو ایوانِ اقتدار میں ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے سیاہ و سپید کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تو اسلام "الیکشن" میں امیدواری ہی کا قائل نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہیں کروں گا"۔ اس لئے لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور خود اپنی پیش کش کرنا کہ ہمیں اس ذمہ داری کے لئے منتخب کرو، بجائے خود ایک غیر اسلامی بلکہ غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ طریقہ ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ خود لوگ اس سے خواستگار ہوں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لئے خود امیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ووٹ

انتخابی امیدوار —— اسلامی معیار

الیکشن کا بگل بج چکا ہے، جلسے جلوس، اشتہارات، وعدے اور وعیدیں ایک دوسرے کی کردار کشی، بلند بانگ دعووں کا ایک سیلاب ہے، جو ملک کے گوشہ گوشہ میں رواں دواں ہے، کیا شہر اور کیا دیہات؟ گھر گھر اور قریہ قریہ، آنے والے الیکشن کی گونج ہے، بیچ قسموں کی بھی بن آئی ہے، نذرانے اور پیشکش گویا ں بھی طرح طرح کی کی جا رہی ہیں، دعائیں اور آشیرواد بھی لئے جا رہے ہیں، جن گندی بستیوں، تنگ اور تیرہ و تاریک گلیوں کی طرف قائدین کبھی پھٹک کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اب قائدین کا ایک ہجوم ہے، جو بن بلائے مہمانوں کی طرح صبح و شام ان مقامات کا چکر لگا رہا ہے، جن غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، ووٹ کی کشکول تھامے بڑے بڑے سورما اور بھاشا مانتے تو کہا جائے " فرعونِ وقت " ان کی خوشامدیں کر رہے ہیں، ایسے ایسے وعدے کئے جا رہے ہیں کہ گویا ہر گھر میں دودھ کی نہر بہادیں گے اور شہد کے چشمے پھوٹ پڑیں گے۔ امیدواروں کا تعلیمی اور اخلاقی معیار بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، بعض حضرات اپنے دستخط بھی " پرتکلف " کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ انگوٹھے کے نشان سے کام چلایا ہے، بعض حضرات کی تعلیمی سطح پرائمری اور مڈل اسکول تک ہے، اخلاقی اقدار کا حال اس سے بھی برا ہے، کسی پر داہزنی کا مقدمہ ہے، کسی پر قتل کا، تو کسی پر ذخیرہ اندوزی کا، رہ گئی رشوت اور مالی خرد برد تو یہ تو اس طبقہ کے لئے ایک " معمول " کی بات ہے!

ان حالات میں ووٹ کے لئے امیدواروں کے انتخاب میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا ان کی سوچ وہی ہو جو عام لوگوں کی ہے، زمانہ جس رخ پر چل رہا ہو، اسی رخ پر چل پڑنا، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنا، تعلقات اور شخصی مفادات کی بنا پر امیدوار کا انتخاب کرنا، ان کو ووٹ دینا اور ووٹ دلانا، ان کی تشہیر کرنا، ان کی

الامین (القصص: ۲۶)

صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ جب قانون ساز مجلس میں پہنچنے کے بعد وہ شخص صحیح موقف کی رہنمائی کر سکے، صحیح موقف سے مراد یہ ہے کہ اس کی رائے قرآن و حدیث اور شریعت اسلامی کے مخالف نہ ہو، دوسرے اس میں مسلمانوں کے ملی مفادات کی رعایت ہو، تیسرے اس کی رائے ملک اور ملک کے تمام شہریوں کے لئے خیر خواہی پر مبنی ہو، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں شعور و آگہی ہو، وہ ضروری حد تک شریعت کے احکام سے واقف ہو، زمانہ شناس اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو، دوسرے اپنی بات کو مؤثر انداز میں اور قانون و منطق کی زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جرأت اظہار ہو، کیوں کہ وکیل کی زبان میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بعض اوقات اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ ایک شخص کی رائے ایک جماعت کی رائے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ سنت نبوی بھی ہے کہ کسی بات کے کہنے کے لئے مناسب شخص کا انتخاب کیا جائے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے مسلمان منتخب ہو کر مجالس قانون ساز میں پہنچتے ہیں کہ خود ان کے شعور و آگہی کی سطح بہت پست ہوتی ہے، ان میں مدلل طریقہ پر سوال اٹھانے اور مخالف سوال کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ عوام میں جذباتی تقریر کرنا آسان ہے، لیکن دلیل کی زبان میں اپنی بات کو ثابت کرنا اسی قدر دشوار۔

دوسرا ضروری وصف "امانت و دیانت" کا ہے، امانت ایک جامع لفظ ہے، یہ صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر قول و فعل اس کی وسعتوں میں داخل ہے، فکر و سوچ میں بھی امانت مطلوب ہے، فکر کی امانت یہ ہے کہ انسان قومی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذاتی مفاد کے بجائے قومی اور ملی مفاد کے پس منظر میں سوچے، امانت زبان سے بھی متعلق ہے، زبان کی امانت یہ ہے کہ سچی اور درست بات کہی جائے، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنی پارٹی اور حکومت کی خوشامد و چاپلوسی سے بچا جائے، قول و عمل میں تضاد نہ ہو، زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق ہوں، اور یقیناً امانت و دیانت کا تعلق مال و معاملات سے بھی ہے، ایک زمانہ میں جھوٹے وعدے کے علاوہ ممبران کو جب

الیکشن میں امیدوار ہونے کے لئے قلیل العیال ہونے کی شرط

اس وقت ریاست آندھرا پردیش میں پنچایت الیکشن کی آمد آمد ہے، حکومت نے اس بار الیکشن کے لئے ایک نیا قانون متعارف کرایا ہے کہ الیکشن میں وہی لوگ حصہ لے سکیں گے جن کے دو سے زیادہ بچے نہ ہوں، گویا الیکشن کو فیملی پلاننگ کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت ہی نامعقول اور نا معقول اصول ہے، اور کسی طرح اس کا جواز نہیں، اولاً تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ کیا الیکشن کے سلسلہ میں یہ اصول ملک کے دستور اور عقل عام کے تقاضے کے مطابق ہے؟ دوسرے کیا الیکشن میں اس طرح کی قیود و حدود لگانا فیملی پلاننگ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے موثر اور مفید ہے؟ تیسرے خود فیملی پلاننگ کا نظریہ کس حد تک عقل اور قانون فطرت کے مطابق ہے؟

جہاں تک اس قانون کی معقولیت کی بات ہے تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا مقصد قوم کی اجتماعی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر انتظامی صلاحیت ودیعت ہو، انتظامی صلاحیت کا تعلق انسان کے فہم، سمجھ بوجھ اور ذہنی صلاحیت اور قوت فکر سے ہے، اور دیانت کا تعلق انسان کے قلب و ضمیر، جذبۂ خدمت اور خلوص سے ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بہتر اجیر اس شخص کو قرار دیا ہے جو قوی اور امین ہے، "ان خیر من استاجرت القوی الامین" (القصص ۲۶) "قوی" سے مراد صلاحیت اور متعلقہ کام کی اہلیت کے مطابق ہونا ہے، اور "امین" سے اشارہ امانت و دیانت کی طرف ہے، حقیقت یہ ہے کہ قیادت کے لئے ان سے بہتر کوئی معیار نہیں ہو سکتا

بھی اسی طرح کے قوانین نافذ کرے تو اگر ملازمتوں اور حکومت کے وسائل سے استفادہ کی صورتوں میں بھی یہ پالیسی اختیار کی گئی تو یہ نہایت ہی نقصان دہ بات ہوگی، اس سے حق داروں کی حق تلفی ہوگی، اور ملک کی لگام نااہل لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اور کسی بھی ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

خود کفیلی یا تحفظ ایک ایسا نظریہ ہے جس کو تجربات اور واقعات نے رد کر دیا ہے، جو لوگ اس نظریے کے بانی اور موسس تھے، ان کے قیاس کی رو سے اس وقت دنیا کو دانے دانے کا محتاج ہونا چاہئے تھا، اور انسانیت کے بہت بڑے حصے کو فاقوں پر گذر کرنی چاہئے تھی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ پوری دنیا میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی معیار زندگی بلند ہوا ہے، کھانے پینے، لباس و پوشاک، سواری اور زندگی کے ہر شعبے میں زیادہ راحت بخش وسائل کا استعمال بڑھا ہے، زمینوں کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، اور اگر مغربی ممالک اپنی زراعتی تکنالوجی ترقی پذیر ممالک کو فراہم کریں تو زرعی وسائل میں ناقابل تصور اضافہ ہو سکتا ہے، جو انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے۔ اور ایسا سبز انقلاب رونما ہو سکتا ہے جو کسی شخص کو بھوکے پیٹ نہ سلائے۔ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں بعض ایسے قدرتی وسائل بھی انسانوں کی گرفت میں آئے ہیں جنہوں نے صحراؤں اور ریگستانوں کو باعث رشک کر دیا ہے، کیا قدرت کی اس فیاضی کے باوجود خود کفیلی یا تحفظ کا نظریہ کوئی معقولیت رکھتا ہے؟ اور اس کو قانون فطرت سے ہم آہنگ قرار دیا جا سکتا ہے؟۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آج دنیا میں ہمارے ملک کو جو اہمیت حاصل ہے یا حاصل ہوتی جا رہی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک اپنی سرمایہ کاری کے لئے ہماری طرف کیوں متوجہ ہیں؟ اور ملٹی نیشنل کمپنیاں کیوں ہماری دلداری کرتی ہیں؟ اسی لئے کہ یہ آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے، یہ ایشیا کی تجارت کے لحاظ سے بہت بڑی مارکیٹ ہے، یہ افرادی وسائل کے اعتبار سے بہت خوش قسمت خطہ ہے، پوری دنیا کو جہاں سے ماہرین

سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہاں سے کتنی اور تیز تر حروف دوسرے ملک اپنے وسائل کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، اگر شرحِ پیدائش پر بہت زیادہ کنٹرول ہو جائے اور افرادی وسائل ہمارے پاس کم ہو جائیں تو ہم کس طرح اس اہمیت کو برقرار رکھ سکیں گے؟۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ وہ اس کا رب اور پالنہار بھی ہے، کائنات کے ایک ایک ذرہ پر اس کی نظر ہے، وہ ایک منصوبہ کے ساتھ آبادی کو بڑھاتا اور گھٹاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رزق کے خزانے ہمارے پاس ہیں، اور ہم اس کو ایک متعین مقدار میں عطا کرتے ہیں: "وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ" (الحجر: ۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ضرورت کے لحاظ سے غذائی وسائل فراہم کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کتنے ہی جانور ایسے ہیں کہ بظاہر ان کی روٹی روزی کا کوئی سامان نہیں، لیکن یہ اللہ کی رزق رسانی کا کرشمہ ہے کہ وہ تم جیسے قوتِ عمل اور فہم و شعور کی حامل مخلوق کو بھی رزق دیتا ہے اور ان کو بھی: "اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ" (العنکبوت: ۶۰) قرآن نے ایک موقع پر یہ بات بڑی وضاحت سے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی چاہت کے مطابق رزق کا سروسامان فراہم فرماتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے بندوں سے بڑے باخبر ہیں، اور انہیں دیکھ رہے ہیں: "وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ" (الشوریٰ: ۲۷)

جب انسان اپنی کوتاہ عقلی اور اپنی فکر و نظر کی محدودیت کے باوجود ایک انتظام کے ساتھ ہر کام انجام دیتا ہے، اور دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بجٹ بناتی ہیں تو کیا خدائے علیم و بصیر اور رزاق و قدیر کو اپنے بندوں کی ضرورت اور کائنات میں اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل کا کچھ اندازہ نہ ہوگا؟۔

(۹؍ستمبر ۲۰۰۰ء)

خواتین کے لئے تحفظات — اسلامی نقطۂ نظر

اس وقت ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز میں خواتین کے لئے تحفظات کا مسئلہ پورے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ذرائع ابلاغ کچھ ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا اس مسئلہ کے حل ہوتے ہی قوم کی تقدیر بدل جائے گی، اور ملک کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جو سیاسی قائدین اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھتے، خواہ یہ مناسب نہ سمجھنا ملک کے فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے ہو یا رائے عامہ کے دباؤ سے، وہ بھی کھلے عام اس تجویز کی مخالفت سے ڈر رہے ہیں اور دبے لفظوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ تجویز قانون بن جاتی ہے تو مستقبل کی سیاست پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے، پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے لئے یہ ضرب کاری کا درجہ رکھتی ہے، ان طبقات میں خواتین کا تعلیمی تناسب اتنا معمولی ہے کہ بظاہر مناسب خاتون امیدواروں کا ملنا دشوار ہے، پھر جو خواتین منتخب ہوں گی وہ پارلیمنٹ میں کما حقہ ان کمزور طبقات کی ترجمانی کر سکیں، یہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ یہ بات بھی بعید نہیں کہ سیاست میں حصہ لینے والی خواتین کے خلاف جرائم کا رجحان بڑھ جائے، جیسا کہ پچھلے دنوں مغربی بنگال میں ہوا ہے، کیونکہ آج کل سیاست میں پڑھے لکھے، دیانتدار افراد کی بجائے شرپسند عناصر اور کندۂ ناتراش قسم کے لوگوں کا غلبہ ہے، بڑا لیڈر بننے کے لئے اسی درجہ کا غنڈہ اور مکر و فریب کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، ایسے لوگ حسد یا محرومی کا شکار ہو کر ان خواتین کو اپنا نشانہ بنائیں جو سیاست میں ان کی رقیب بنی ہوں، تو کچھ عجب نہیں۔

اگر واقعی سیاست داں عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مسیحائی کرنے میں سنجیدہ ہیں تو اس کا صحیح طریقہ اسمبلی میں تحفظات نہیں، بلکہ ان کی حقیقی مشکلات کو دور کرنا ہے، اگر ملک بھر سے سو ڈیڑھ سو خواتین پارلیمنٹ میں پہنچ بھی گئیں تو یقیناً ان میں نوے فیصد

حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ امانتوں کے ضائع کرنے سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو جس کام کا اہل نہ ہو اس کو وہ کام سپرد کیا جائے ـــــ "اذا وسد الامر الی غیر اھلہ" ـ (بخاری ۱۳۲۱)

یہ نہایت بنیادی اور اہم بات ہے، کوئی بھی شعبہ ہو، اس کے کام اور انتظام میں اصل بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کی تقسیم میں صلاحیت اور اہلیت کے بجائے رشتہ داریاں، قرابت مندیاں، حیثیت عرفی، شخصی و سیاسی مفاد کی توقع، کوئی عہدہ نہ دینے کی صورت میں اس سے نقصان اور مضرت کا اندیشہ، ذات برادری، علاقہ، وطن وغیرہ کو معیار بنایا جائے۔ مثلاً ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے بعض شعبوں میں ذات پات کی بناء پر ریزرویشن ہے، اس ریزرویشن کے نتیجہ میں بعض حضرات ستر اور اسی فیصد نمبر لاکر بھی داخلہ سے محروم رہ جاتے ہیں اور جن لوگوں کو تحفظات حاصل ہیں، وہ اگر ان میں امیدوار کم ہیں تو پچیس فیصد نمبر لانے کے باوجود داخلہ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے لوگ ڈاکٹر اور انجینئر بنیں گے اور قوم کو تختۂ مشق بنائیں گے تو یہ ملک و قوم کے مفاد میں ہوگا یا ان کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا؟ یہ محتاج اظہار نہیں۔

ہندوستان کی خواتین میں تعلیمی تناسب بہت کم ہے اور جو کچھ ہے وہ شہروں میں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سوسائٹی سے زیادہ میل جول نہیں رکھتیں، اس لئے فطری بات ہے کہ سماج کے حالات سے وہ نسبتاً کم واقف ہوتی ہیں، پھر مشترک مجمع میں خواتین کے لئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار دشوار ہوتا ہے، ان حالات میں خواتین کو نمائندہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سماجی مشکلات اور بالخصوص دیہات و قریہ جات کے مسائل کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکے گی، نیز مخلوط ماحول میں ان کے لئے کام کرنا اخلاقی نقطۂ نظر سے خود ان کے لئے دشواری کا باعث ہوتا ہے، جیسا کہ آفسوں اور دفتروں میں تجربہ ہے۔ اس لئے درحقیقت بنیادی طور پر تحفظات کا تصور ہی غلط تصور ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ عہدہ داروں کے انتخاب میں تعصب کے رویہ کو ختم کیا جائے، تمام قوموں کو مساوی طور پر ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں، نہ یہ کہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل ہو یا نہ ہو،

وہی تنخواہ بہتر ہو سکتی ہے جو محنت کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں اور قابل برداشت ہو۔ کسی کلینک میں ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر اور ایک ناخواندہ مزدور پہنچیں تو ڈاکٹر کا تقرر بحیثیت طبیب ہوگا اور مزدور کا بحیثیت جاروب کش۔ ظاہر ہے یہ مساوات نہیں ہے، لیکن یہی تقاضۂ عدل ہے اور اسی میں سماج کا مفاد ہے۔

اسلام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان عدل کا قائل ہے نہ کہ مساوات کا۔ حقیقی مردوں اور عورتوں کے درمیان فطری طور پر صلاحیتوں کا فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہیں، جیسے جسمانی مشقت، دوڑ دھوپ، شجاعت و بہادری، جرأت و بے باکی، قوت فیصلہ، اقدامی صلاحیت اور مدافعت کی طاقت۔ عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں، قوت فیصلہ بھی ان میں کم ہوتی ہے، اسی لئے طبی اعتبار سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عورتوں کے دماغ کا حجم مردوں سے کم ہوتا ہے، مردوں کا مغز دماغ عورتوں کی بہ نسبت سو گرام زیادہ ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا، عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے۔ قلب جو زندگی کا مرکز ہے، عورتوں کا مرد کے مقابلہ ساٹھ گرام چھوٹا ہے، بعض طبی ماہرین کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی قوی میں کم سے کم ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے۔

جہاں بعض اوصاف اور صلاحیتوں میں مردوں کو تفوق حاصل ہے، وہیں بعض پہلوؤں سے عورتوں کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ عورتوں میں حیاء کا غلبہ ہوتا ہے، محبت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں، لطافت و نزاکت سے بھی قدرت نے عورتوں کو زیادہ حصہ دیا ہے، عورتوں میں جذب و کشش زیادہ ہے اور اسی باعث وہ مردوں کے قلب و ذہن پر بھی چھا جانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہیں۔ صلاحیتوں کے اسی فرق کی وجہ سے اسلام نے اندرونِ خانہ کی ذمہ داریاں عورتوں کو سپرد کیں، کہ وہ اپنی اولاد کو، اپنے شوہر کو، بھائی بہنوں اور پورے خاندان کو جو تحفۂ محبت دے سکتی ہیں اور گھر میں محبت و سکون کی فضاء کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ مرد نہیں کر سکتا اور بیرونِ خانہ کی جد و جہد اور جانفشانیوں کو جس طرح مرد انجام دے سکتا ہے، عورتیں انجام نہیں دے سکتیں۔

یہ ایک فطری تقسیم ہے اور اس میں خاندانی نظام کا بقا ہے۔ مغربی معاشرہ میں خاندانی نظام کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اس بکھراؤ نے ان کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مرد ہو یا عورت، دونوں کو گھر کے اندر سکون نصیب ہے نہ گھر سے باہر، اسی لئے مغربی ممالک میں نفسیاتی عوارض عام ہیں، جرائم کا رجحان روز افزوں ہے، اور لوگ امن و سکون کی دولت کے لئے اسی طرح بے چین ہیں جیسے سخت دھوپ کا خوب پیاسا آدمی ٹھنڈے پانی کے لئے۔

پس کیا ہم مغرب سے ان کی بے سکونی اور اضطراب و بے چینی کو خرید کرنا چاہتے ہیں؟۔

(۱۷/ جولائی ۱۹۹۸ء)

مردم شماری میں حصہ لینا۔ ایک اہم دینی فریضہ!

سیرت نبوی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اسلام کی تائید و تقویت اور مسلمانوں کے ملی وجود کی حفاظت کے لئے تمام اسباب اختیار کرنے چاہئیں، جو اس زمانہ میں مروج ہوں، اور ان میں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بکثرت اس کی مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نے دعوت توحید کے لئے پہلی دفعہ صفا کی پہاڑی کا انتخاب کیا، اور وہاں جا کر اہل مکہ کو اکٹھا کر کے اپنی بات کہی: یہ کوئی اتفاقی انتخاب نہ تھا، بلکہ پہلے سے اہل مکہ کا طریقہ چلا آ رہا تھا کہ کسی اہم بات کی اطلاع دینے کے لئے اسی مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلاتے تھے، گویا یہ اس زمانے کا ذریعۂ ابلاغ تھا، اور مکہ شہر کی حد تک اس سے زیادہ وسیع الاثر کوئی اور ذریعۂ ابلاغ موجود نہیں تھا، عرب میں دو بڑے اجتماعات ہوتے تھے، جن میں پورا جزیرۃ العرب امڈ آتا تھا، ایک حج اور دوسرے عکاظ کا تجارتی میلہ۔ ان دونوں اجتماعات میں بہت سی منکرات اور فواحش کا ارتکاب کیا جاتا تھا، حج میں تو بہرحال ایک پہلو عبادت کا بھی تھا، گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل اسوہ میں بہت کچھ آمیزشیں کردی گئی تھیں، لیکن عکاظ کے میلے کی نوعیت مذہبی نہیں تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ ''کل عرب تک'' ان دونوں اجتماعات میں جاتے، اور لوگوں پر دعوت اسلام پیش فرماتے، کیونکہ اس وقت اس سے زیادہ موثر، زود رفتار اور وسیع الاثر کوئی اور وسیلہ نہیں تھا۔

عربوں کا ایک قدیم قبائلی نظام تھا، جس کے مطابق قبیلے کے ایک شخص کو پورے قبیلے کی پناہ حاصل ہوتی تھی، اور اگر قبیلے کے ایک شخص کے خلاف بھی کوئی زیادتی کی جاتی تو پورا قبیلہ اسے اپنے آپ پر تصور کرتا تھا، آپ ﷺ بنو ہاشم میں تھے، اور اس وقت اس قبیلے کی قیادت ابوطالب کے ہاتھ میں تھی، جو آپ کے چچا تھے، لیکن بولادے بڑھ کر آپ

کے ذریعہ قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، ہندوستان میں برہمن ازم اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، کبھی معاشی طاقت کی بنیاد پر تقسیم برپا کی جاتی ہے اور قوم یہود اپنے چشم و ابرو کا تابع بنا کر رکھتی ہے، جیسا کہ اس وقت صہیونی طاقت کا حال ہے، غرض کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق اپنی طاقت کو بڑھانا، اس طاقت کو دین و ملت کی سربلندی کے لئے استعمال کرنا اور ظالموں کے تسلط سے بچنے کے لئے اس کو ڈھال اور ہتھیار بنانا امت کا فریضہ اور رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔

آج کی دنیا میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ تعداد و مقدار کی بھی بڑی اہمیت ہے، جس سے کسی قوم کا سیاسی مقام متعین ہوتا ہے، انتخابی سیاست کے نقشہ میں اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے، جو زبان کسی علاقہ میں بولی جاتی ہو، اس زبان کی قدر و قیمت بھی بولنے والوں کی تعداد پر منحصر ہے، اسی پس منظر میں تمام ملکوں میں اور خاص کر جمہوری ملکوں میں مردم شماری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹ فروری سے چھٹی مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے، جو ۲۸ فروری تک جاری رہے گی، اور یکم مارچ تک نظر ثانی اور تبدیلی کی مہلت ہوگی۔ اس مردم شماری پر تقریباً ۲۰ ارب روپے خرچ ہوں گے، اس بار مردم شماری نسبتاً زیادہ تفصیل سے عمل میں آرہی ہے، جس میں مذہب، زبان، تعلیم اور معاشی حالات کے علاوہ معذورین اور ان کے حالات بھی مرکز توجہ ہوں گے، اور ان ہی اعداد و شمار کی روشنی میں ملک میں آئندہ سیاسی، تعلیمی اور معاشی منصوبہ بندی ہو سکے گی۔

اردو ہماری مادری زبان ہے، اور عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں جس میں علوم اسلامی کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو، بلکہ بعض موضوعات پر اردو میں ایسی کتابیں بھی آچکی ہیں کہ شاید عربی میں بھی اس جیسی کتاب نہ ہو، فارسی حالانکہ صدیوں سے مسلمانوں کی زبان ہے، اور ایک بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے، لیکن اردو نے صرف ڈیڑھ دو سو سال میں نہ صرف فارسی کی برابری حاصل کرلی، بلکہ اسلامی فکر و عقیدہ، علم و عمل اور تہذیب و ثقافت کی ترجمانی میں غالباً فارسی سے بہت آگے جا چکی ہے، بدقسمتی سے آزادی کے بعد سے مسلسل اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے، اور اس لئے حکومت کو بھی اردو

طریقہ کے مطابق چولہوں کی تعداد کے مطابق افراد کا اندازہ کریں تو ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اور ان کی ہمتیں شکست ہو جائیں، ان تدبیروں کا مقصد کبر اور اپنی بڑائی جتانا مقصود نہیں تھا، بلکہ یہ اس وقت کی مصلحت تھی، اور اسے اسلام کی تائید و تقویت اور مسلمانوں کی حفاظت کے ایک مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

پس ہر دور میں اپنی قوت جتانے، اپنی طاقت کا اظہار کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کا دفاع کرنے کے الگ الگ ذرائع ہوتے ہیں، اس دور میں ان ہی ذرائع کو اختیار کرنا حکمت پسند فراست ایمانی اور اسوۂ نبوی کا تقاضا ہے۔

(۲۳ فروری ۲۰۰۰ء)

کلوننگ ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

فروری ۱۹۹۷ء سائنس اور ایجاد و اکتشاف کی دنیا میں ایک ایسا مہینہ بن کر آیا، جسے شاید کبھی فراموش نہ کیا جا سکے۔ اسی مہینہ میں اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر ایان ولمٹ نے روزلین انسٹی ٹیوٹ کے تحت ایک ایسی بھیڑ کی پیدائش کا تجربہ کیا جس میں نر جانور سے کوئی مدد نہیں لی گئی، صرف مادہ کے ذریعہ یہ بھیڑ وجود میں آئی اور اس کا نام "ڈولی" رکھا گیا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو ۲۷۷ دفعہ ناکامی سے دوچار ہو کر کامیابی کی منزل تک پہنچا تھا۔ جہاں اس تجربہ نے سائنسی تجربہ کرنے والوں کو شادکام کیا، وہیں اس نے عام لوگوں کو محو حیرت کر کے رکھ دیا۔

اس تجرباتی عمل کو "کلوننگ" کا نام دیا گیا۔ کلوننگ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو یونانی لفظ "کلون" (Klon) سے ماخوذ ہے۔ کلون کے اصل معنی "نئی پھوٹنے والی شاخ" کے ہیں۔ کلوننگ (Cloning) کا لفظ اب وقت ہم شکل کی پیدائش یا نقل تیار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے عربی میں اس کو "استنساخ" کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں "فوٹو کاپی کرنا"۔ نباتات میں کلوننگ ایک زمانہ سے مروج ہے اور حیوانات پر ایک عرصہ سے اس کے تجربہ کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۵۲ء میں دو امریکی سائنس دانوں رابرٹ برگس اور تھامس کنگ نے کلوننگ کے ذریعے مینڈک کی پیدائش کو ممکن بنایا۔ ۱۹۹۳ء میں انسانی کلوننگ کی کوشش کی گئی اور اس میں ایک حد تک پیش رفت بھی ہوئی، لیکن اسے رحم میں نہیں ڈالا گیا، گویا تجربہ کو آخری مرحلہ تک پہنچانے سے اجتناب برتا گیا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں ایک اور پیش رفت ہوئی اور "ریگن یونیورسٹی، امریکہ" میں کلوننگ کے ذریعہ دو ہم شکل بندروں کی پیدائش عمل میں آئی۔ بندر کا جسمانی نظام انسان کے جسمانی نظام سے بہت قریب تصور کیا جاتا ہے اور اسی مماثلت نے

ڈارون کو یہی نظریہ تک پہنچایا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا، پھر ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے وہ انسان بنا ہے۔ حالانکہ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص لکڑی کی کرسی اور میز کو دیکھ کر یہ قیاس کرنے لگے کہ کرسی اصل میں میز ہی تھی، میز ہی نے ترقی کرکے کرسی کا روپ اختیار کیا ہے۔

لیکن "ڈارونزم" سے قطع نظر یہ ضرور ہے کہ بندروں میں کلوننگ کے کامیاب تجربے نے انسان پر اس تجربے کے کامیاب اور بار آور ہونے کو امکان سے بہت قریب کر دیا ہے اور اگر مستقبل قریب میں انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی اطلاع ملے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ سائنس کی اس نئی پیش رفت سے متعدد اعتقادی اور سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور کئی سوالات ہیں جو غور و فکر کے منتظر اور جواب کے متقاضی ہیں، اور اس وقت ان تمام سوالات پر غور کرنا اور ان کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا غالباً قبل از وقت ہوگا، جب تک کہ اس کے نفع و نقصان کے تمام پہلو سامنے نہ آجائیں۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے نظام کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اللہ ہی کے خالق ہونے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق اللہ خود ہی فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (زمر ۶۲) ارشاد ہے کہ تخلیق کا تمام تر فیصلہ خدا ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف ۵۴) قرآن چیلنج کرتا ہے کہ تمام لوگ مل کر بھی ایک مکھی تک کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (الحج ۷۳) قدرت کا نظامِ تخلیق ایک ایسا رازِ سربستہ ہے کہ نہ ماضی میں اس سے پردہ اٹھایا جا سکا ہے اور نہ مستقبل میں اٹھ سکے گا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ مرد و عورت میں تولید کی پوری صلاحیت موجود ہے، لیکن پھر بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور ڈاکٹرز محرومی کے راز کو پانے اور سمجھنے سے عاجز ہیں، تو کیا کلوننگ کے ذریعہ یہ عمل خدا کے نظامِ تخلیق میں دخل ہونے کے مترادف ہے اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ ہی کے خالق ہونے کی نفی ہوتی ہے؟ یہ ایک اہم اعتقادی سوال ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں خود کلوننگ کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ کلوننگ

سے عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا جسم بے شمار خلیوں سے مرکب ہے، جسم میں یہ خلیے مسلسل ٹوٹ کر ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ خلیہ کا ہر جز خود ایک مکمل خلیہ بن جاتا ہے، ہر ایک خلیہ میں "مرکزہ" (Nuclus) ہوتا ہر مرکزہ میں چھیالیس "کروموزوم" (Chromosome) ہوا کرتے ہیں، لیکن جنسی خلیے یعنی نر کے مادۂ منویہ اور مادہ کے بیضۂ انثی میں تئیس تئیس کروموزوم ہی ہوتے ہیں، یہ بھی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ اس طرح نر و مادہ سے مل کر چھیالیس کی تعداد مکمل ہوتی ہے تاکہ جب بچے کی تخلیق ہو تو اس میں ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات پیدا ہوں اور اسی لئے بچوں میں صورت و شباہت، رنگ و روپ اور مزاج و اخلاق میں ماں اور باپ دونوں ہی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کلوننگ کا بنیادی عمل یہ ہے کہ مادہ کے بیضہ میں کسی خلیہ سے مرکزہ نکال لیا جاتا ہے اور جسم کے کسی اور حصے کے خلیے سے مرکزہ نکال کر اس خلیہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ مرد کے جسم سے بھی لیا جا سکتا ہے اور عورت کے جسم سے بھی۔ جسم کے دوسرے حصوں میں ایک مرکزہ چھیالیس کروموزوم کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح مرد و عورت سے مل کر کروموزوم کی یہ تعداد مکمل ہو جاتی ہے، اب نئے جنین کے وجود میں آنے کے لئے یہ عمل کافی ہو جاتا ہے، اب اگر کسی مادہ کے بیضہ میں اسی کے جسم سے حاصل کیا ہوا مرکزہ ڈال دیا جائے تو نر سے اتصال کے بغیر بچہ کی پیدائش عمل میں آ سکتی ہے اور چونکہ اس میں صرف اسی مادہ کے کروموزوم ہیں، اس لئے وہ بچہ شکل و صورت کے اعتبار سے اسی عورت کے مشابہ ہوگا، اگر مادہ کے بیضے میں کسی نر کا "کروموزوم" رکھا گیا ہو تو چونکہ بچے کے جسم کی تشکیل صرف اسی نر کے کروموزوم سے ہوئی ہے، اس لئے بچے میں پوری مماثلت اسی نر کی ہوگی، پھر جب بار آوری کا مرحلہ طے ہو جائے تو جنین کی افزائش کے لئے اسے مادہ کے رحم میں ڈالنا ہوگا اور عام تولیدی نظام کے مطابق وہ بچہ کو جنے گی، چاہے اسی مادہ کے رحم میں ڈالا جائے جس کا بیضہ ہے یا کسی اور مادہ کے رحم میں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ کلوننگ سے جو مماثلت پیدا ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ فکر و شعور

اور عادات و اخلاق کے اعتبار سے بھی ان میں مشابہت پائی جائے، کیونکہ ان امور کا تعلق محض مادۂ تخلیق سے نہیں ہوتا، بلکہ تعلیم و تربیت، سماجی اور خاندانی ماحول اس سلسلہ میں زیادہ موثر اور دخیل ہوتے ہیں۔

کلوننگ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کلوننگ سے پیدائش کے لئے بھی مادہ کا بیضہ ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ بیضہ کے بارآور ہونے کے بعد اسے مادہ کے رحم میں ڈالا جائے اور عام تخلیقی نظام کے مطابق جیسے کی کروموسوم کا وجود بھی ضروری ہے، البتہ اس طریقہ پیدائش میں نر کا واسطہ ضروری نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انسان نے تخلیق کی قدرت حاصل کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تدبیر کی قدرت دی ہے، شوہر و بیوی کا اتصال بھی ایک تدبیر ہے، جو بچے کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس تدبیر کو نتیجہ خیز بنانے کا نام تخلیق ہے، اس پر کسی انسان کو قدرت نہیں۔ اسی ڈولی کی پیدائش کی کوشش میں ۲۷۷ تجربات ناکام ہوئے اور سائنس داں اس بات کو بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ تجربات کیوں ناکام ہوئے اور اسی طرح کا ایک تجربہ کیوں کامیاب ہو سکا؟ ایک صاحب ایمان کے لئے یہ کامیابی اور ناکامی نہ تعجب کی بات ہے اور نہ حیرت و تعجب کی۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر تدبیر مرضی الٰہی کے تابع ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نہ ہو کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو مرد سے اتصال کے بغیر تنہا عورت سے بچے کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، حضرت حوا علیہا السلام کے بارے میں کہا ہے کہ تنہا مرد سے ان کی پیدائش عمل میں آئی، اس لئے اگر کلوننگ کے ذریعہ تنہا عورت سے کسی بچے کی پیدائش کا واقعہ پیش آئے تو یہ قرآن کی تصدیق ہوگی نہ کہ تکذیب، اور یہ اسلام کے تصور تخلیق کی موافقت ہوگی، نہ کہ اس کی مخالفت۔

کلوننگ سے متعدد شرعی مسائل بھی متعلق ہیں، کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش کی صورت میں نسب ثابت ہوگا؟ نسب اس عورت سے متعلق ہوگا جس کا بیضہ لیا گیا ہے یا اس عورت سے جس کے رحم میں جنین کی پرورش ہوئی ہے؟ کیا یہ بات درست ہوگی کہ کسی

اجنبی مرد کے مادۂ منویہ کو عورت کے بیضہ میں رکھا جائے؟ کیا خود شوہر بیوی کے درمیان ایسا عمل کیا جا سکتا ہے؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ وہ لاولد ہوں، کسی شخص کے کروموزوم سے جس بچہ کی پیدائش ہوگی وہ اس شخص کا بھائی تصور کیا جائے گا یا بیٹا؟ اور اسی طرح کے متعدد سوالات ہیں جو انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی صورت میں ابھر کر سامنے آئیں گے۔

بادیٔ النظر میں انسان کے معاملہ میں کلوننگ ایک خطرناک اور مضرت رساں تجربہ ہوگا، اس کی وجہ سے اولاد کے لئے نکاح کی احتیاج ختم ہو جائے گی، ظاہر ہے کہ اس طرح نکاح کی شرح بھی کم ہوگی، اس سے جو سماجی مسائل پیدا ہوں گے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچے اپنی شناخت اور خاندان سے محروم ہوں گے اور اس طرح خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ اسلام میں زنا کی حرمت اور نکاح کی اہمیت کا منشاء اس کے سوا کیا ہے کہ نسب کی حفاظت ہو اور خاندان کی تشکیل عمل میں آسکے، اس سے تلبیس اور فریب کا دروازہ کھلے گا۔ جرائم پیشہ لوگ اپنے ہم شکل بچوں کے وجود میں آنے کی تدبیریں کریں گے تاکہ فریب اور دھوکہ دہی سے کام لے سکیں۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس تدبیر سے پیدا ہونے والے بچے بعض فطری صلاحیتوں سے محروم اور نقائص کے حامل ہوں، کیوں کہ جب کوئی کام فطرت کے عام اصول سے ہٹ کر کیا جاتا ہے تو ضرور وہ منفی اثر سے دوچار ہوتا ہے، اس لئے قدرت نے تخلیق کا جو عام طریقہ رکھا ہے، اس کو چھوڑ کر غیر فطری راستہ تلاش کرنا بے وقوفی بھی ہے اور انسانیت کے ساتھ ظلم بھی۔

تاہم کلوننگ کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جن سے طبی فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں اور وہ صورت ہے ''جین کلوننگ'' (Gene Cloning) کی۔ کروموزوم دراصل چھوٹے چھوٹے دانوں سے مرکب ہوتا ہے، یہی دانے جین (Gene) کہلاتے ہیں، انسان کی صحت اور بیماری سے ان دانوں کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اب یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ کسی جین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا جین رکھ دیا جائے، لہٰذا اگر کوئی جین کسی

خاص مرض کا باعث ہو اور سے نکال کر اس کی جگہ دوسرا صحت مند عنصر رکھا جا سکے تو اس طرح جس بیماری کا علاج ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ کلوننگ کی یہ صورت جائز ہوگی اور یہ علاج کے قبیل سے ہوگا، اور شاید اسی طریقہ علاج سے ایسے امراض کا علاج بھی ممکن ہو جن کو لاعلاج سمجھا جاتا ہے، جیسے کینسر اور ایڈز وغیرہ۔ اور یہ اس حدیث کی تصدیق ہوگی جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج پیدا نہ کیا ہو۔

(۱۱ر ستمبر ۱۹۹۸ء)

لائی ڈیٹکٹر ــــــ اسلامی نقطۂ نظر

جرائم میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے، جرائم کی تحقیق و تفتیش کے لئے بھی نت نئے آلات و وسائل ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ ایسے ہی آلات میں ایک وہ مشین ہے جسے لائی ڈیٹکٹر (Lie Detector) یعنی "جھوٹ کا مخبر" کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس کا استعمال زیادہ ہے اور عرصہ سے جاری ہے، لیکن ہندوستان میں ابھی قریب ہی میں یہ آلہ متعارف ہوا ہے۔ یہ آلہ دراصل انسان کی ان اندرونی کیفیات کا مخبر ہے جن کو انسان چھپانا چاہتا ہے۔

اس طریق تفتیش کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر مجرم کسی سوال کا خلاف واقعہ جواب دے اور جھوٹ بولے تو اس کی اندرونی کیفیت میں فرق آجاتا ہے، دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، سانس پھولنے لگتی ہے، پھر اندرونی کیفیت کا اثر جسم کے بیرونی حصے پر بھی پڑتا ہے، اس کا ہاتھ انجانے میں گردن اور چہرے کی طرف اٹھتا ہے۔ گفتگو میں ہچکچاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، کبھی کبھی کاندھے کو اچکاتا ہے۔ وہ اپنے مخاطب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات اسے پسینہ بھی آجاتا ہے، گویا جسم کا اندرون اور بیرون دونوں ہی اس کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیتا ہے، اگر انسان اپنی بیرونی کیفیت پر کسی طرح قابو بھی کر لے تو اندرونی کیفیت پر قابو پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اس میں ایک پہلو تو عبرت و موعظت کا ہے، اور دوسرا پہلو فقہی اور قانونی ہے کہ شرعاً کسی جرم کو ثابت کرنے کے لئے یہ آلہ کس حد تک معتبر ہو سکتا ہے؟ عبرت و موعظت کا پہلو یہ ہے کہ انسان اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح گواہوں کے درمیان گھری ہوئی ہے؟ ایسے گواہ جن کی آنکھیں خلوت و جلوت یہاں

تک کہ اس کے دل و دماغ کی اپنے اندر چھپی ہوئی چیزیں، انسان کی کارگزار یادداشتیں کر رہے پھر بھی خدا کی طرف سے اتنے گواہ موجود ہیں جو ان یادداشتوں کو تیار کر کے واقعہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا میں ان گواہوں نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا ہے۔ لیکن آخرت میں پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ یہ تمام راز دار اپنے رازوں کو کھول کر رکھ دیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دائیں اور بائیں کاندھوں پر دو فرشتوں کو مقرر کیا ہے، جو ان کی نیکیوں اور برائیوں کو مسلسل لکھ رہے ہیں اور انسان کی آخری سانس تک لکھتے رہیں گے۔ پھر یہ ریکارڈ محفوظ ہو جائے گا اور قیامت کے دن انسان کے سامنے اس کی نیکیوں اور برائیوں کا میزانیہ پیش کیا جائے گا۔ انسان اپنے نامہ اعمال کو دیکھتا ہوگا اور اقرار کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ لیکن جو لوگ اتنے ڈھیٹ ہوں گے کہ اس وقت بھی جھوٹ بولنے سے نہیں شرمائیں گے اور اپنی برائیوں سے انکار کر جاتے ہیں گے۔ تب ان کی زبان بند ہو جائے گی اور قوت گویائی ساتھ چھوڑ دے گی تو جسم کا ایک ایک عضو اس کے خلاف گواہی دینے کے لئے بول پڑے گا اور ہر عضو یہ کہانی سنائے گا کہ اس شخص نے اس کو کن کن برائیوں کے لئے استعمال کیا تھا؟ یہاں تک کہ زمین اور عمارات بھی ان کی نیکیوں اور برائیوں کے احوال سنائیں گے اور انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

ایک زمانہ میں لوگ اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ انسان کی پوری زندگی کا سارا اعمال نامہ مرتب ہو تو اس کے لئے کتنی ہی جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ قیامت میں اس ضعیف و نزار انسان کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال تھما دیا جائے؟ لیکن آج کے کمپیوٹر عہد میں اس قسم کا اعتراض بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، جب انسان ایک معمولی دو تین انچ کی ڈسک میں ہزاروں صفحات محفوظ کر سکتا ہے تو خدائے خبیر و علیم کے لئے ایک مختصر سے اعمال نامہ میں پوری انسانی زندگی کو محفوظ کرنا کیا دشوار ہے؟ اسی طرح جب دنیا میں انسان کی اندرونی اور بیرونی کیفیات اس کے مجرم ہونے کی گواہی دیتی ہیں تو آخرت

میں انسان کے اعضاء کا گواہ بننا کوئی ایسی بات نہیں جو ایک حقیقت پسند انسان کے لئے حیرت کا باعث ہو ـــــ اگر انسان غور و تدبر سے کام لے تو جتنی نئی سائنسی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں وہ اسلام کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے ذریعہ اسلام کے تصور آخرت کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سائنسدانوں کی اس ریسرچ کے مطابق جھوٹ کی وجہ سے سب سے زیادہ انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے اور قلبی کیفیت میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کے قلب پر اس کے گناہوں کا اثر پڑتا ہے۔ جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑتا ہے، اگر آدمی توبہ کرلے تو یہ دھبہ دھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے، پھر جب دوبارہ وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور انسان اتنا بے توفیق ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گناہ پر ذرا بھی ندامت اور پشیمانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے گناہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہر وہ بات گناہ ہے جس سے دل میں کھٹک پیدا ہو۔ الاثم ما حاك في نفسك (ترمذی باب الزہد) پس ارتکاب جرم کی وجہ سے قلب کی کیفیات میں ظاہری تغیر معنوی تغیر کی دلیل اور تصدیق ہے۔

جھوٹ اسلام کی نظر میں غیر معمولی اور بدترین گناہ ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ (احیاء علوم الدین: ۳/۱۳۵) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنا کسی بھی درجے میں مسلمانوں کے شایان شان نہیں۔ آپ ﷺ جو دعائیں فرمایا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خداوندا! میرے قلب کو نفاق سے محفوظ رکھئے، بے عفتی سے حفاظت فرمایئے اور میری زبان کو جھوٹ سے بچایئے!! (احیاء علوم الدین: ۳/۱۳۵) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کو روا نہیں رکھا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے۔ (ابوداؤد: ۲/۶۸۱) بلکہ آپ ﷺ

اقرار کر لے۔ اگر وہ اقرار نہ کرے تو مدعی اس کے خلاف گواہان پیش کرے۔ پھر مختلف معاملات میں گواہان کا نصاب الگ الگ ہے۔ زنا کے ثبوت کے لئے چار مرد گواہان مطلوب ہیں، قصاص اور حدود یعنی وہ جرائم کہ جن کی سزا شریعت کی جانب سے متعین ہے، کے مقدمات میں کم سے کم دو مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ دوسرے مالی اور غیر مالی معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہے۔۔۔ اگر گواہان موجود نہ ہوں تو ملزم سے قسم کھلائی جائے گی اور قسم کھا کر وہ بری ہو جائے گا۔ فیصلہ کی چوتھی بنیاد قسم سے انکار ہے یعنی اگر ملزم قسم کھانے سے انکار کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے جرم کا اقرار متصور ہوگا۔ اسی طرح اگر ملزم موقع دیئے جانے کے باوجود دفع الزام سے گریز کرتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے جرم کا اقرار تصور کیا جائے گا۔

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے یہ بنیادی ذرائع ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدد اور طریقے ہیں جن سے دعوے ثابت کئے جاتے ہیں۔ ان میں ایک "قرائن قاطعہ" ہیں، یعنی کسی بات کو ثابت کرنے والی ٹھوس علامتیں۔ جیسے کوئی شخص کسی مکان سے نکلے، اس کے ہاتھ میں خون سے لت پت چھری ہو، چہرہ سے خوف نمایاں ہو اور رفتار تیز ہو، پھر اسی وقت لوگ گھر میں داخل ہوں تو ایک لاش دیکھیں جو تازہ خون سے لت پت ہو اور گھر میں کوئی اور شخص نہ ہو تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ یہی شخص اس کا قاتل ہے۔ (البحر الرائق ۷، ص ۲۰۵) — لائی ڈیٹکٹر کے ذریعہ کسی شخص کے جھوٹ کی تحقیق بھی دراصل قرائن ہی کی قبیل سے ہے اور کوئی ماہر نفسیات ہی اپنے شخص کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس آلہ کی رپورٹ کس درجہ اس کے سچ اور جھوٹ کو ظاہر کرتی ہے؟

تاہم میرا خیال ہے کہ محض اس آلہ کی رپورٹ پر سنگین جرائم میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ آلہ اصل میں سچ اور جھوٹ کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اندرونی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔ جھوٹے آدمی پر ایک طرح کا خوف طاری ہوتا ہے، یہی خوف ہے جس کی وجہ سے کیفیات میں تغیر رونما ہوتا ہے۔ اگر ملزم کسی اور وجہ سے دہشت زدہ ہو اور نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو، جب بھی اس میں یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں، کیوں کہ بے خوفی

محافظینِ قانون کے لئے لاقانونیت کا جواز

حکومت اور مملکت کی تشکیل کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم انسانی بستیوں کے بسنے اور آباد ہونے کی ہے، کیوں کہ انسانی سماج کے لئے یہ ایک فطری ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی شکل میں پیدا فرمایا ہے جو ایک دوسرے کی حد درجہ محتاج ہے، یوں تو ہر جاندار کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے؛ لیکن بہ مقابلہ انسان کے وہ ایک دوسرے کے کم محتاج ہیں، گائے اور بکری کے بچے چند دنوں میں خود مکتفی ہو جاتے ہیں، نہ ان کو اپنے چارہ کے لئے خود زراعت کرنی ہوتی ہے کہ مزدوروں کے محتاج ہوں، نہ ان کو کسی تاجر سے خوراک و پوشاک خریدنی ہے، اور نہ کسی باورچی سے پکوان کرانا ہے؛ لیکن انسان اپنی ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ہی جیسے کتنے ہی انسانوں کا محتاج ہے، اسے سامان خریدنے کے لئے تاجر کی، اناج کے لئے کاشتکار کی، پکوان کے لئے باورچی کی، صفائی کے لئے مزدور کی، اور سواری کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے اور نہ جانے زندگی کے مختلف مسائل میں وہ کتنے ہی لوگوں کا محتاج ہے؛ نیز ہم جنسوں پر ظلم و زیادتی کا عنصر بھی انسانوں میں بہ مقابلہ بہت سی مخلوقات کے زیادہ ہے۔ حکومت سماج کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے، تا کہ ان کی ضروریات پوری ہو سکیں، اور سماج میں عدل و انصاف قائم رہ سکے، قیام حکومت کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں، اگر حکومت کسی طبقہ کے ظلم کو جواز عطا کر دے، تو اس سے زیادہ کوئی امر باعث افسوس نہیں ہوگا۔

اس وقت ہندوستان میں پولیس اور سیکوریٹی عملہ کی ظلم و زیادتی ضرب المثل بنی ہوئی ہے، ان حضرات کی طرف سے عوام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، عام طور پر ان کے

معاملہ میں والدین کا مانند شہ رہتا ہے، کیوں کہ گواہی دینے والا کوئی اچھا خیر مطالبی پڑتی ہے۔ بعض واقعات میں لوگ جانفشانی سے یا کسی مصلحت اختیار کر لیتے ہیں، چنانچہ کئی مقدمات میں قاتل اور اغوا کنندگان کے اداروں میں کم سن بچے پاتے ہیں، دیگر جرم کر کے شبہ کا فائدہ پہنچنے کی وجہ سے ان کو کسی تادیب نہیں ہوتی ہے، ان پر جو سزائیں دی جاتی ہیں، ان کی نوعیت بھی آخر بہت معمولی ہوتی ہے۔ مظلوم تو بے چارہ جان سے بھی گیا، لیکن ظالم زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لئے معطل کر دیا گیا، یا چند مہینوں کی قید ہوئی۔

ہماری حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ سرکاری محکمات ان کے مظالم کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی ہو، اور ان کی انسانیت سوز مظالم پر معمولی گوشمالی بھی کی جائے، بلکہ حکومت بہت ہی ڈھٹائی کے ساتھ کوشش کرتی ہے کہ سیکورٹی فورس سے متعلق انسانی حقوق کی پامالی کی بہت مقدمات میں انہیں چھوٹ دی جائے، اور ان کے جرم سے درگذر کیا جائے، یہ گویا مجرموں کی پیٹھ تھپتھپانا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، خوب کیا ہے، یہ بالکل ناقابل فہم بات ہے، سیکورٹی فورس امن فراہم کرنے، مظلوموں کی مدد، ظالموں کے ہاتھ تھامنے اور معاشرہ میں عدل وانصاف کو نافذ کرنے کے لئے ہے، اگر سیکورٹی فورس کے لوگ ایسے جرائم کے مرتکب ہوں تو وہ یقیناً زیادہ سزا کے مستحق ہیں، کیوں کہ وہ نہ صرف ایک جرم کے مرتکب ہیں، بلکہ وہ جس کام کی روٹی کھا رہے ہیں، انہوں نے عین اس کے برعکس حرکت کا ارتکاب کیا ہے، چوکیدار اس لئے ہے کہ وہ چوری روکے، لیکن اگر چوکیدار خود چور ہی ہو جائے تو پھر کون ہوگا جو چور کا ہاتھ تھام سکے!

اسلامی تعلیمات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ مجرم بہر حال مجرم ہے، اور کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، یہاں تک کہ سربراہ مملکت بھی اسی قانون کا پابند ہے، جو دوسروں سے متعلق ہے، اس کے لئے بھی کوئی چھوٹ اور استثناء نہیں، اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عرب کے ایک معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے چوری کا ارتکاب کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، لوگوں کو یہ بات بہت گراں گذری، انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں سفارش

کریں، لیکن سفارش کون کرے؟ چنانچہ آپ ﷺ کے محبوب حضرت زید بن حارثہ کے محبوب بیٹے حضرت اسامہ بن زید کو سفارش کے لئے وسیلہ بنایا گیا۔ جب حضرت اسامہ نے آپ ﷺ سے سفارش کی تو آپ بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ اگر اس کی جگہ فاطمہ بنت محمد بھی ہوتیں تو ان کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔

خلفاء راشدین نے بھی تمام لوگوں کے لئے انصاف کی ایک ہی ترازو رکھی، حضرت عمر ؓ نے حضرت ابی بن کعب ؓ کو قاضی مقرر فرمایا تھا، ایک مقدمہ میں ایک صاحب نے حضرت عمر ؓ کو مدعی علیہ بنایا، قاعدہ کے موافق اگر مدعی گواہان پیش نہ کر سکے تو مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے، چنانچہ اس اعتبار سے حضرت عمر ؓ کے ذمہ قسم کھانا تھا، لیکن حضرت ابی بن کعب ؓ نے حضرت عمر ؓ کے مقام کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے فریق سے خواہش کی کہ امیر المومنین کو قسم سے سبکبار کر دیں، حضرت عمر ؓ کو حضرت ابی بن کعب ؓ کی یہ بات پسند نہیں آئی کہ وہ عدل کے معاملہ میں ان کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کریں، اور مقدمہ کے دو فریق کے درمیان یکسانیت میں فرق آنے دیں، چنانچہ آپ نے اس پر اپنی ناگواری اور ناخوشی کا اظہار فرمایا۔

حضرت علی ؓ کے زمانے کے ایک مشہور قاضی شریح ہیں، جنہیں طویل عرصہ اور کئی خلفاء کے عہد خلافت میں کار قضاء انجام دینے کا موقع ملا، حضرت علی ؓ کے خلاف خود ان کے عہد خلافت میں ایک یہودی نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، حضرت علی ؓ نے اپنی طرف سے دو گواہان پیش کئے، حضرت حسن ؓ جو آپ کے صاحبزادے ہیں، اور جن کی توثیق خود رسول اللہ ﷺ سے ہو چکی تھی، اور قنبر، جو آپ ؓ کے غلام تھے، قاضی شریح نے بے تکلف دونوں شہادتیں یہ کہہ کر رد کر دیں، کہ بیٹے کی شہادت باپ کے، اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں، اور اس طرح فیصلہ حضرت علی ؓ کے خلاف ہو گیا، وہ یہودی اسلامی عدالت کے اس بے لاگ انصاف سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مشرف باسلام ہو گیا، ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں، نہ صرف عہد صحابہ میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی ملتی ہیں، عہد اموی میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے یہاں اس کی

دورِ حکومت تھی اور خود ہندوستان کے مغلیہ عہد میں آپ کو اس کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر ہے، بلکہ یہ عمومی انسانی مسلّمہ ہے، انصاف کا تقاضہ ہے کہ قانون حق کے لئے اپنوں اور بیگانوں سب کے لئے بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی گروہ تمہاری نگاہ میں برا ہو تب بھی تمہیں انصاف اور عدل کے معاملہ میں کوئی دوئی نہیں برتنی چاہئے (المائدۃ: ۸) اور ایک ہی سلوک روا رکھنا چاہئے، حضرت عمرؓ نے خود اپنے بیٹے پر حد جاری فرمائی اور بعض روایتوں کے مطابق اسی میں ان کی وفات ہوئی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت فیروز نامی ایک مجوسی کے ہاتھوں پیش آئی، حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبید اللہ بن عمرؓ نے اس جوش میں دو غیر مسلموں ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا، حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قصاص کے طور پر عبید اللہ بن عمرؓ کو قتل کر دیا جانا چاہئے، اس وقت کسی طور وہ بچ گئے، مگر پھر حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان سے قصاص لینا چاہا، لیکن وہ حضرت معاویہؓ کی طرف چلے گئے اور جنگ صفین میں مارے گئے۔

یہ بات کہ کسی خاص طبقہ کو ان کی زیادتیوں سے بری کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں ان کو جرم کی چھوٹ دے دینا ہے، خصوصاً جو لوگ قیام امن کے ذمہ دار ہوں، اگر انہیں کو بدامنی اور قانون شکنی کی چھوٹ دے دی جائے تو کس طرح یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ عدل و انصاف پر قائم رہ سکیں گے۔

عدل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ انسان عام معاملات میں عدل کو قائم رکھے بلکہ انسان کی صلاحیت کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اشتعال کے مواقع پر بھی عدل کی راہ سے منحرف نہ ہو، جب فریق مخالف کا رویہ آپ کی انا کو ٹھیس پہنچائے اور جذبات کو برانگیختہ کر دے، اس وقت بھی آپ اپنے آپ پر قابو رکھیں، غصہ کو پینا اور بے قابو کر دینے والے اشتعال انگیز حرکات کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھنا انسان کا بہت بڑا اخلاقی جوہر ہے، اسی کو قرآن نے ''صبر'' اور ''کظم غیظ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (آل عمران: ۱۳۴)

میچ فکسنگ ـــــ مرض اور علاج

جب کسی معاشرے میں برائی رواج پاتی ہے تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ہر جگہ اپنی پنجہ گاڑ دیتی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن کا کچھ ایسا ہی حال ہے۔ پہلے نچلی سطح کے ملازمین تھوڑی بہت رشوت لیا کرتے تھے، پھر پولیس والوں نے اس میں قدم رکھا، اور اس فن میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ جیسے گالی گلوچ اور بدزبانی سے پولیس پہچانی جاتی تھی، اب کرپشن بھی اس محکمے کے لئے "وجہ شناخت" ٹھہری۔ پھر اعلیٰ عہدیداروں میں اس مرض نے سرایت کیا، یہاں تک کہ وزراء اور مقننہ نے سوچا کہ عوام کی نمائندہ ہو کر ہم اس "کارخیر" میں پیچھے کیوں رہیں؟ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء اور چوٹی کے سیاستدان اس میں ملوث ہوئے، اور ایسے ایسے اسکینڈل سامنے آئے کہ ماضی میں کسی وزیر، مقتدر سیاسی رہنما کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ چونکہ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے ہے، بعض اوقات وہ خود اس میں ملوث ہوجاتا ہے، اور اس وقت ایک معزز جج بھی رشوت کے مقدمے میں ماخوذ ہیں، جب عدل و انصاف اور دیانت کے معیار ایسے باوقار اداروں اور ملک کے اعلیٰ ترین رہنما اور قائدین اس حمام میں ننگے ہوں تو اوروں کو پوچھتا ہی کیا ہے؟

اس وقت ایک نیا قصہ کرکٹ بورڈ کا اٹھا ہے، کھلاڑی تو بہرحال کھلاڑی ہی ہیں، جن کی پوری زندگی تماشبینوں کے لئے وقف ہے، جیسے ہی میچ فکسنگ کا ایک واقعہ سامنے آیا، اور ایک کھلاڑی نے خلاف جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے پیسے لے کر قصداً اپنے کھیل کو کمزور کرنے کا اعتراف کیا، ایسا لگا کہ گویا ایک طوفان سا آگیا، اور میچ فکسنگ میں ہندو پاک کے بڑے بڑے نامی گرامی اور نامور بیٹسمین اور چند پسندیدہ کھلاڑیوں کا نام

مال حاصل کیا جاتا ہے، اس سے انسان بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، اور تمام مجرمانہ افعال کی بنیاد اصل میں یہی ذہنیت ہے، پھر جس کا نقصان ہوتا ہے اس کو بھی یہ بات گراں گذرتی ہے کہ ایک شخص نے بغیر کسی سعی و محنت کے میرا حقیقی مال چھین لیا، اس سے دلوں میں نفرت و عداوت کی تخم ریزی ہوتی ہے، اور بغض و حسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں، اور بعض اوقات نہایت ہی ناگفتہ بہ واقعات پیش آجاتے ہیں، جوئے کے لئے کوئی عقلی جواز بھی نہیں، غور فرمایئے کہ فتح و شکست تو "الف" اور "ب" کے درمیان ہوئی "ج" اور "د" کا نہ جیتنے میں کوئی دخل ہے اور نہ ہارنے میں، لیکن ہوا یوں کہ "ج" نے "د" کو محض ایک زبانی شرط کی بنیاد پر کثیر رقم ادا کی، غور کیجئے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی عقلی جواز ہے؟؟

جیت اور ہار میں بھی اسلامی تصور یہ ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف طریقہ پر ہو، کوئی ایسا مصنوعی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو کھیل کے مقابلہ میں غیر حقیقی نتیجہ کو ظاہر کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا جلب ولا جنب" (ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب این تصدق الاموال) یعنی جلب اور جنب درست نہیں ہے، "جلب" سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص گھوڑ دوڑ کے مقابلہ میں شریک ہو، اس کے گھوڑے پر اس طرح چیخا اور آواز لگایا جائے کہ اس میں دوڑ کی خصوصی امنگ پیدا ہو جائے اور "جنب" سے مراد یہ ہے کہ جس گھوڑے کو دوڑ کے مقابلہ میں شریک کیا گیا ہے، اس گھوڑے کے ساتھ دوسرا گھوڑا بھی رکھا جائے، یہاں تک کہ جب سواری کا اصل گھوڑا سست گام ہو تو سوار چالاکی کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جائے۔ (بذل المجہود ۳، ر ۶۲۹ ط. ہند) گویا ہار جیت میں دھوکے سے کام لیا جائے یا خارجی طریقہ پر اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھائی جائے۔

اس حدیث سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف ہونا چاہئے، خارجی عوامل کے ذریعہ مقابلہ کو متاثر کرنا درست نہیں، پھر کھیل میں اپنی کارکردگی کو متاثر کرنے کے پیچھے مالی حرص و طمع کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور رشوت لے کر معاملات طے کئے جاتے ہیں، جو بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو، لعنة الله على الراشي

والمرتشی (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۲۳۱۳) بعض احادیث میں رشوت کو دونوں کا ثالث بھی قرار دیا گیا ہے، بلکہ جو شخص رشوت میں واسطہ بنتا ہو، بیچ لینے کا کردار ادا کرتا ہو اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی لعنت بھیجی ہے: والرائش الذی یمشی بینھما (مسند احمد: ۵/۲۷۹) اس لئے یہ نہایت ہی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب انسان کے اندر حرص و طمع گھر بنا لیتی ہے، تو پھر انسان کی پیاس بجھتی نہیں ہے، اگر اسے ہفت اقلیم بھی ہاتھ آجائے تب بھی اس کی طلب ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتی رہتی ہے، عام طور پر کھلاڑیوں کی آمدنی بڑے بڑے تاجروں اور اعلیٰ ترین سرکاری ملازمین اور عوامی نمائندوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور جو شہرت انہیں حاصل ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے باوجود مال کی ایسی نہ بجھنے والی پیاس ناقابل فہم نظر آتی ہے!

اس پس منظر میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ ہمارے ملک میں سڑکوں کا جال، معاشی بہبود، سائنسی ترقی، عوام کے لئے وسائل سہولت کی فراہمی وغیرہ پر تو دن رات محنت ہو رہی ہے، لیکن سماج میں اخلاقی قدروں کو بلند کرنے اور لوگوں کو انسان بنانے کی کوئی منظم اور منصوبہ بند سعی نہیں ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سنگین جرائم میں ملوث پائے جا رہے ہیں، کرپشن نے عدل و انصاف اور قانون کے اعلیٰ ترین اداروں تک رسائی حاصل کر لی ہے، ملک کے انٹرنیشنل کھلاڑی جو آج کے مزاج کے مطابق ملک کا وقار اور اس کے لئے عزت و آبرو کا نشان سمجھے جاتے ہیں وہ ملک سے باہر چند پیسوں میں قوم کی عزت اور خود اپنی عزت و آبرو کا سودا کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ قانون اور مادی وسائل کے ذریعہ ان بیماریوں کا علاج نہیں ہو سکتا، جب تک ہم سماج کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے اور ہر طبقہ میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں، ایسے واقعات کا سد باب بھی نہیں ہو سکتا، اور جب تک ضمیر نہ جاگ جائے کوئی دوا ان بیماروں پر کارگر نہیں ہو سکتی!

(دسمبر ۲۰۰۰ء)

کھیل — آداب و احکام

انسان کی فطرت میں قدرت نے جو دواعی اور تقاضے رکھے ہیں، ان میں ایک تفریح طبع بھی ہے، چاہے وہ شعر و ادب اور ظرافت و مزاح کے ذریعہ ہو یا کھیل کود کے ذریعے، اس لئے کھیل کود بھی ایک حد تک انسانی فطرت کا حصہ ہے، اسی لئے بچے جو ہر طرح کی تعلیم و تربیت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور براہِ راست فطرتِ انسانی کے آغوش میں پلتے ہیں، وہ بھی کھیل کود کی طرف رغبت رکھتے ہیں، پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو دیکھئے کہ لڑکے اپنے بچپن ہی سے ایسے کھیل کا رجحان رکھتے ہیں جو مردانہ مزاج و مذاق کے حامل ہیں، جیسے دوڑنا، کودنا وغیرہ اور لڑکیاں بچپن ہی سے ایسے کھیل کی طرف راغب ہوتی ہیں جو زنانہ مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں، جیسے: بچے کھلانا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ۔

اسلام سے پہلے کھیل کود کے معاملہ میں بھی بڑی بے اعتدالی پائی جاتی تھی، یورپ جو سچ پوچھئے تو تہذیب و تمدن کا ''ازلی معلم'' سمجھتا ہے، اس کا حال یہ تھا کہ غلاموں کے باہم قاتلانہ مقابلے کرائے جاتے اور درندہ جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا، جو آخر انسانی بربادی و ہلاکت پر ختم ہوتا، لوگ اس سنگ دلانہ قتل کا تماشہ شوق سے دیکھتے اور تالیاں بجاتے، یہ کھیل ''سپورٹ'' کہلاتا تھا اور یورپ میں اس کے لئے بڑے بڑے اسٹیڈیم بنے ہوئے تھے، پروفیسر لیکی نے ''تاریخ اخلاق یورپ'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسلام مذہبِ فطرت ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں فطری تقاضوں کی رعایت کی ہے اور جہاں کہیں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے، وہاں افراط و تفریط کو دور کر کے ایک معتدل اور متوازن طریقہ کی رہنمائی کی ہے۔ اس نے کھیل کود کی بھی بالکلیہ نفی نہیں کی، بلکہ مناسب حدود و قیود کے ساتھ اس کی اجازت مرحمت فرمائی، کھیل کے سلسلے میں

جو بنیادی شرعی اصول ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ کھیل میں ان امور کی رعایت کی جائے

(۱) کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو، اگر مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو۔ اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیوں کہ حصۂ ستر کو چھپانا شرعاً واجب ہے۔

(۲) ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جا سکتا ہو، جیسے فٹ بال، والی بال، ایسا طویل کھیل نہ ہو، جو آدمی کو شرعی فرائض اور دینی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے، جیسے شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، چوسر، ایسے کھیل مکروہ ہیں۔ تاش وغیرہ بھی کراہت سے خالی نہیں۔ فقہاء حنفیہ کے یہاں شطرنج بغیر جوے کے بھی مکروہ ہے اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے جس میں جسمانی توانائی صرف نہیں ہوتی اور انسان گھنٹوں کھیل میں لگا رہتا ہے، یہ چیز انسان کو تن آسان بناتی ہے اور اپنے اصل مقصد سے غافل کر دیتی ہے۔ کرکٹ کے شائقین سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آج کل یہی کیفیت بلکہ اس سے بڑھ کر کرکٹ دیکھنے والوں کا حال ہے، یہ کھیل شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے کہ نتیجہ حاصل ہونے میں کئی کئی دن لگ جاتا ہے اور نہ صرف اسٹیڈیم میں آنے والے بلکہ پوری دنیا میں کرکٹ کے شائقین ٹی وی پر آنکھیں اور ریڈیو پر کان لگائے رہتے ہیں، کیسا بھی کام کر رہے ہوں، ذہن کرکٹ کی طرف لگا رہتا ہے۔ طلبہ کے امتحان کا وقت ہے لیکن کرکٹ کا بخار اس پر غالب ہے، وہ مزدور جس کی حالت یہ ہے کہ "دن میں کماتے تو رات کو کھاتے" وہ بھی بال بچوں کی فکر سے آزاد کرکٹ دیکھنے اور کامنٹری سننے میں لگا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس میں بیشتر لوگ دو وقت کے کھانے کو ترستے ہوں، ایسے کھیل مناسب نہیں اور شاید اسی لئے ترقی یافتہ ممالک میں یہ کھیل مقبول نہیں۔

(۳) ایسا کھیل نہ ہو جو خود یا دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کوئی امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ، ایسے کھیل بھی

جائز نہیں ہیں۔

(۴) مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی کبڈی درست نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

(۵) کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو جائز نہیں، کیوں کہ جوا حرام ہے۔ جوے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کھلاڑی آپس میں یہ شرط باندھیں کہ جو ہارے گا وہ جیتنے والے کو اس شرط کے مطابق مال ادا کرے گا یا دوسرے لوگ کھلاڑی، آپس میں شرط کر لیں کہ اگر فلاں کھلاڑی جیتا تو الف، ب کو اور اس کا مخالف جیتا تو ب، الف کو اتنی رقم ادا کرے گا، یہ صورت قطعاً ناجائز اور سخت گناہ ہے۔ اگر چند کھیلنے والے ہوں اور دو طرفہ شرط نہ ہو بلکہ ایک طرفہ شرط ہو، مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تم کو اتنی رقم دوں گا اور میں جیت گیا تو تم کچھ نہیں دینا، یہ صورت جوے میں داخل نہیں اور جائز ہے، اسی طرح کھیلنے والے آپس میں شرط نہ باندھیں بلکہ ایک تیسرا شخص کہے کہ تم دونوں میں سے جو جیت جائے گا میں اسے اتنی رقم دوں گا، یہ صورت بھی درست ہے، کیوں کہ یہ جوا نہیں، انعام ہے۔

(۶) ایسے کھیل جس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو، جو صحت انسانی کے لئے مفید ہو اور جس سے انسان کے اندر قوت مدافعت بہم پہنچتی ہو، مستحب ہے اور اسلام ایسے کھیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

یہ کھیل کے سلسلے میں بنیادی شرعی اصول ہیں اور ان کی روشنی میں مختلف قسم کے کھیلوں کے بارے میں حکم شرعی جانا جا سکتا ہے۔

کچھ کھیل جن کا احادیث سے ثبوت ہے، یہاں ان کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے۔

❁ "دوڑ" کو آپ ﷺ نے پسند فرمایا، خود آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ راوی ہیں کہ میں پہلے حضور ﷺ سے بڑھ جاتی، جب میرا جسم بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ مجھ پر سبقت لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ

ریس کا بدلہ جو کچھ معتدہ بقلک السبقة حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ مدینہ تک دوڑ کا مقابلہ کرے؟ یہ شخص اتنا تیز دوڑتا تھا کہ لوگ اس پر سبقت حاصل نہیں کر پاتے تھے، میں نے اس سے کہا کہ تم کو کسی کی عزت و شرافت کا بھی خیال نہیں، یعنی تم بڑے چھوٹے کو دعوت مقابلہ دے رہے ہو، اس نے کہا کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے میں کسی اور کو دعوت مقابلہ دینے سے باز نہیں آسکتا، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی اور مقابلہ کیا تو سبقت حاصل کر لی۔ (نیل الاوطار: ۲۳۸۸) اسی لئے فقہاء اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

✿ اسلام کشتی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ رکانہ رضی اللہ عنہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو دعوت مقابلہ دیا، آپ ﷺ نے قبول فرمایا، کشتی ہوئی، آپ ﷺ جیت گئے اور یہی شکست حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا باعث بنی۔ (نیل الاوطار ۲۳۸۸)

مگر کشتی سے مراد یہاں صرف وہ کشتی ہے جس میں فریق مخالف کو زمین پر گرا دیا جائے، وہ فری اسٹائل کشتی نہیں جس کا آج کل رواج ہے اور جس میں فریق مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ وار کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ شدید جسمانی نقصان پہنچایا جاتا ہے؛ اخلاقی اور انسانی حدود سے متجاوز ایسی کشتیاں بالکل جائز نہیں اور حرام ہیں۔ موجودہ زمانے میں جوڈو کراٹے بھی کشتی کے حکم میں ہے، کیوں کہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے، البتہ کراٹے کا ایسا مقابلہ جائز نہیں جس میں دوسرے فریق کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی اجازت ہو۔

✿ تیراکی کو بھی حضور ﷺ نے پسند فرمایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا ہر چیز جو لعب ہے سوائے چار چیزوں کے، شوہر اپنی بیوی سے دل لگی کرے، اپنے گھوڑے کی تربیت کی جائے، دو مقررہ نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا۔ (الجامع الصغیر ۲/۲۳) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل شام کو خاص طور پر تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری سیکھنے کی نصیحت فرمائی تھی اور اس سلسلہ میں ان کو ایک خط لکھا تھا۔ (فیض القدیر ۳/۲۰۷)

✿ گھوڑ دوڑ بھی جائز ہے، آپ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ کرایا، جو گھوڑے چھریرے اور پتلے بدن کے ہوتے ان کے لئے دوڑنے کی حد حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک ہوتی اور جو بھاری بدن کے ہوتے ان کی ''ثنیۃ الوداع'' سے ''مسجد بنو زریق'' تک (بخاری مع الفتح ۲؍۲۱۲) گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانور جیسے اونٹ کی دوڑ کرانی بھی جائز ہے، خود حدیث میں اونٹ کی دوڑ کا ذکر موجود ہے: لا سبق الا فی نصل او خف او حافر (ابو داؤد) لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہے جب کہ اس میں قمار اور جوئے کی صورت نہ ہو، آج کل جو گھوڑ دوڑ ہوتی ہے، جس کا اصل مقصد جوا ہی ہوتا ہے، یہ جائز نہیں۔

✿ تیر اندازی کی بھی آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر کام جو تفریح طبع کے طور پر کیا جاتا ہے، نادرست ہے، سوائے تین باتوں کے، ان میں ایک تیر اندازی کا ذکر فرمایا (ترمذی) یہ بھی روایت گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے بچوں کو تیر اندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بچوں کو تیر اندازی سکھانے کا حکم فرمایا، گو یہ روایت ضعیف ہے۔ (الجامع الصغیر ۲؍۲۲۷-۲۲۶) موجودہ زمانے میں بندوق وغیرہ کی نشانہ بازی بھی اسی حکم میں ہے۔

(۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

ٹریفک — شرعی ہدایات

گذشتہ ہفتہ حکومت کے اعلان کے مطابق ہمارے شہر میں ٹریفک سیفٹی کا ہفتہ منایا گیا ہے، حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً لوگوں میں ٹریفک کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے اس طرح کے ہفتے منائے جاتے ہیں، جو یقیناً ایک مستحسن قدم ہے، واقعہ ہے کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی، بے اصولی اور نامناسب حد تک جلد بازی کی وجہ سے حادثات میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں اخبار سڑک حادثہ کی اطلاع سے خالی ہو اور کچھ جانیں اس کی وجہ سے ضائع نہ ہوئی ہوں۔ اسلام نے اس مسئلہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے اور قرآن و حدیث میں ہمیں اس سلسلہ میں اصولی ہدایات مل سکتی ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور کچھ باتوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے، ان باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا ضروری ہے، ان میں کسی کمی و اضافہ کی گنجائش نہیں، کچھ چیزیں وہ ہیں کہ نہ ان کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا گیا ہے، ان سے انسانی مصلحت متعلق ہے کہ نہ صراحتاً شریعت میں ان کے معتبر ہونے کا ذکر ہے اور نہ نامعتبر ہونے کا، ان چیزوں کے بارے میں حکومت کو حق ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی انتظامی قانون بنائے اور حسب ضرورت لوگوں پر کسی پہلو کو لازم قرار دیدے۔ اسلام کے اصول قانون کی اصطلاح میں ان کو "مصالح مرسلہ" کہا جاتا ہے، جیسے: انسان دائیں بھی چل سکتا ہے اور بائیں بھی، شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ہے کہ چلنے میں کون سی سمت اختیار کی جائے اور کون سی سمت اختیار نہ کی جائے، حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے عوام کو پابند کر سکتی ہے کہ وہ متعینہ سمت سے ہی سفر کرے، اس

زمین پر اکڑ کر چلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہے کہ سینے تنے ہوئے ہوں اور گردن میں تکبر سے اکڑی ہوئی ہوں، لیکن اکڑ کر چلنے کی صرف یہی ایک کیفیت نہیں، بلکہ ہر وہ چال جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہو اور دوسروں کی تحقیر مقصود ہو، اس چال پر اسی کا مصداق ہے۔ آپ گاڑی پر سوار ہیں اور آپ کو یہ گوارا نہیں کہ کسی کی گاڑی آپ سے آگے رہے، تو آپ یا تو اس کو پیچھے رکھنے کے لیے خود آگے بڑھنے کے در پے ہیں، اس کے لئے نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، بار بار ہارن بجا کر اسے پریشان کرتے ہیں تو یہ بھی اکڑ کر چلنے ہی کے حکم میں ہے۔ تواضع کی چال یہ ہے کہ آپ اپنی رفتار معتدل رکھیں، جو آپ سے آگے چل رہا ہے اسے آگے رہنے دیں۔ اگر کسی کی سواری آپ سے پیچھے ہے، لیکن اس کی رفتار بمقابلہ آپ کی سواری کے تیز ہے اور راستے میں اس کی گنجائش ہے کہ آپ اسے آگے بڑھنے کا موقع دے دیں تو آپ اس کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اپنے دوسرے بھائی کو آگے بڑھنے دیں۔ یہ تواضع کی چال اور قرآن کی زبان میں ”مشی ہوناً“ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ ﷺ کے ساتھ سفر میں ہوتے اور کسی سمت سے دشمن کا اندیشہ نہ ہوتا تو اہتمام کرتے کہ اپنی سواری کو حضور ﷺ کی سواری سے پیچھے رکھیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اونٹنی آگے بڑھ گئی، یہ اونٹنی بڑی سرکش تھی، روکنے سے بھی نہ رکتی تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات گراں گزری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی فرمائی، لیکن آپ ﷺ نے اس کو معاف کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرما دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اس کی سواری آگے رہے اور دوسرے چلنے والے اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

قرآن مجید نے اچھے انسان کی صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر نا سمجھ لوگ اس سے الجھنے کی کوشش کریں تو وہ سلامتی کی بات کہہ کر گذر جاتے ہیں۔ یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، راستہ میں چلتے ہوئے بار بار اس کی نوبت آتی

راستہ پر بے ضرورت ہارن بجانا بھی پسندیدہ نہیں، اس سے آگے چلنے والے کو وحشت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حادثہ کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس لئے بعض ہارن کی آواز سنجیدہ لوگوں کے لئے گراں خاطر ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے راستہ چلتے ہوئے گھنٹہ بجانے سے منع فرمایا، عربوں کا طریقہ تھا کہ اونٹ کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھ دیتے، جب پورا قافلہ چلتا تو راستہ گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھتا، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس سے بے ضرورت ہارن بجانے کی قباحت پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض حضرات مختلف آوازوں کے ہارن گاڑیوں میں لگاتے ہیں، جیسے کتے کی آواز، چھوٹے بچے کے رونے کی آواز، یہ نہایت ہی ناشائستہ بات ہے، اس آواز کے مکروہ ہونے کے علاوہ لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں اور چونک اٹھتے ہیں، جو خطرناک حادثہ کا باعث ہو سکتا ہے، اس لئے ایسی چیز دل سے گریز ضروری ہے۔

یہ بات بھی مناسب نہیں کہ جہاں پارکنگ کی جگہ نہ ہو وہاں گاڑی کو پارک کر دیا جائے، یہ دوسرے راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف اور مشقت کا باعث ہے، اس سے ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بھی ایمان کا ایک درجہ قرار دیا ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دیا جائے، ہو ادناها اماطة الأذى عن الطريق (مسند احمد، حدیث [illegible]) اذی میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو تکلیف دہ ہوں، خواہ وہ گندگی یا نجاست ہوں یا کچھ اور، اس لئے بے جگہ گاڑی کا کھڑا کرنا بھی اس میں شامل ہے، کیوں کہ اکثر اوقات اس کی تکلیف راستہ چلنے والوں کے لئے گندگی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی ضمن میں یہ ہے کہ پیٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسین تیل پر گاڑیاں چلائی جائیں، کہ یہ یقیناً دوسرے راہ گیروں کے لئے تکلیف و اذیت کا باعث ہے اور اس سے پھیلنے والی آلودگی عام لوگوں کے لئے بھی مضر اور نقصان دہ ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے، گاڑی والوں کا اور گاڑی پر چلنے والے پیدل چلنے والوں کا خاص کر لحاظ رکھیں، بچے اور ضعیف لوگ جو جلد راستہ طے نہیں کر سکتے، ان کی رعایت ملحوظ رکھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے راہ گیروں کو عورتوں کی بابت خصوصی رعایت کا حکم

فرمایا ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد ، حدیث نمبر : ۵۲۷۳) حضرت ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خواتین کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستے کے کناروں سے چلیں۔ (ابوداؤد ، حدیث نمبر : ۵۲۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ کے حصہ میں سواریاں نہ چڑھائی جائیں ، بلکہ ان کو پیدل راہ گیروں کے لئے چھوڑ دیا جائے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے چلا کریں۔

غرض ، راستہ چلتے ہوئے مزاج میں تحمل و برداشت ہو ، رویہ میں اعتدال ہو ، دوسرے راہ گیروں کے ساتھ رعایت اور ایثار کا معاملہ ہو ، اگر دوسرے راہ رو بے احتیاطی سے کام لیں اور نامناسب رویہ اختیار کریں تو ان کے بارے میں عفو و درگذر ہو اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر ٹریفک کے اصول و قواعد کو ملحوظ رکھے ۔ یہ ہیں وہ اصول جن کی طرف قانون شریعت میں اشارہ ملتا ہے۔

(۲۰۰۰/۴/۲۵)

کرنے کے باوجود نام بتانے سے گریز کرتے ہیں، یہ بُری بات ہے۔ اس سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سلام کرنے کے بعد خود ہی اپنا نام بتادے کہ میں فلاں شخص گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار حضرت جابر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، دروازہ پر دستک دی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کون؟ عرض کیا: میں، آپ ﷺ نے ان کے اس جواب کو ناپسند فرمایا۔ (بخاری، مسلم عن جابر) کیوں کہ "میں" سے آنے والے کو پہچانا نہیں جاسکتا ہے، اس لئے اپنے نام کی صراحت ضروری ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو فرمایا: "یستاذن ابو موسیٰ" یعنی ابوموسیٰ حاضری کی اجازت چاہتا ہے، اسی طرح فون کرتے ہوئے پہلے اپنا نام بتادے۔

جس شخص سے گفتگو کرنی ہو، اگر اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ ہو تو خود ہی وضاحت کر دینا چاہئے کہ میں فلاں شخص ہوں اور فلاں شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کے مکتوبات ہیں، کہ آپ ﷺ نے جتنے خطوط لکھے ہیں، ان میں خط کے آغاز پر اپنا نام اور پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تم کسی کے گھر جاؤ، تین بار گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرو، اور اجازت نہ ملے بلکہ خاموشی اختیار کی جائے، تو واپس آجاؤ۔ (بخاری و مسلم عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ) ٹیلیفون کی گھنٹی گویا ملاقات کی اجازت حاصل کرنا ہے، لہٰذا اگر تین بار فون کی گھنٹی بجنے کے باوجود فون نہ اٹھایا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ملاقات کی اجازت نہیں ہے اور فون کا ریسیور رکھ دینا چاہئے۔ بار بار گھنٹی بجا کر تنگ نہ کرنا چاہئے۔

آپ ﷺ کا طریقہ تھا کہ دروازہ پر اس طرح دستک دیتے اور اس طرح سلام کرتے کہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہونے پائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات دیر گئے یا ایسے اوقات میں شدید ضرورت کے بغیر فون کرنے سے گریز کرنا چاہئے جس میں مخاطب کے سونے اور آرام کرنے کا معمول ہو۔ اگر کسی شخص سے طویل گفتگو کرنی ہو تو چاہئے کہ پہلے اجازت حاصل کر لی جائے کہ مجھے اتنی دیر گفتگو کرنی ہے، اگر مناسب ہو تو

اسی وقت گفتگو کریں یا کوئی وقت مقرر کر دیں، اس میں دونوں کے لئے راحت ہے۔ قرآن مجید نے کسی کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینے کا اصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ یہی تمہارے لئے باعث پاکیزگی ہے: "ھو ازکی لکم" (النور: ۲۸) یعنی اس اخلاقی اور برتاؤ سے تمہارے قلوب ایک دوسرے سے پاک اور صاف رہیں گے۔ قرآن کے اس حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ اگر کوئی شخص اپنی مشغولیت کی وجہ سے گفتگو کرنے سے معذرت کر دے تو اس کا برا نہ ماننا چاہئے اور منہ سے تکبر پر محمول کرنا چاہئے، کیوں کہ ہر شخص کے اپنے مشاغل ہوتے ہیں، اس میں دخل اندازی کسی طرح مناسب نہیں۔

قرآن مجید نے ایسی جگہوں پر بلا اجازت آنے کی اجازت دی ہے جو رہائشی نہ ہوں۔ (النور: ۲۹) اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ پبلک مقامات جیسے ایر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، سرکاری اور نجی عوامی اداروں کو ان کے مقررہ اوقات کار میں کسی بھی وقت فون کیا جا سکتا ہے اور ان اداروں سے متعلق تفصیلی استفسار پیشگی اجازت کے بغیر بھی کرنے کی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ملاقات کرنے والوں کا بھی حق ہے: "ان لزورک علیک حقا" ملاقات کے لئے آنے والوں کا حق یہ بھی ہے کہ ان سے ملاقات کی جائے اور کسی شرعی یا طبعی مجبوری کے بغیر ملاقات سے انکار نہ کیا جائے، کہ اس میں ملاقات کو آنے والے کے ساتھ بے احترامی اور بے مروتی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی حکم ٹیلیفون کا بھی ہوگا۔ بلا وجہ فون پر گفتگو کرنے اور جواب دینے سے انکار کرنا بداخلاقی کی بات ہے اور ایک طرح کی حق تلفی ہے، اس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا اور رہتے ہوئے موجود نہ رہنے کی اطلاع دینا گناہ ہے، البتہ اگر جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہ ہو اور صحیح اطلاع دینے میں کسی مسلمان کو ناحق گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ایک اہم تر مقصد کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے، لیکن عام حالات میں اس طرح جھوٹ بولنا نہ شرعاً درست ہے اور نہ اخلاقاً۔

آج کل بعض ایسے فون بھی ہیں جن کے استعمال کرنے کی صورت میں فون کرنے

والے اور وصول کرنے والے دونوں ہی کو پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں، ایسی صورت میں فون کرنے پر تو فون وصول کرنے والے کو زیر بار کرنے کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، ایسے فون کا استعمال دو ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے، یا تو پہلے ہی سے فون پر بات کرنے کی اجازت لے لی گئی ہو یا فون کرنے والا دوسرے فریق کی اجرت بھی ادا کرنے کو تیار ہو اور اس سے وہ مطلوبہ اجرت ادا کرنے کی پیشکش کرے۔

بعض حضرات فون میں موسیقی لگا لیتے ہیں کہ اگر فون کرنے والے کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے تو وہ اس ساز سے محظوظ ہو سکے، اسلام میں موسیقی اور ساز و سارنگی کا تحمل نہیں، اس لئے فون کے ساتھ موسیقی کے ساز لگانا کراہت سے خالی نہیں، یہ اخلاقی تقاضوں کے بھی مغائر ہے، کیوں کہ ہر فون کرنے والا اس موسیقی کے سننے پر مجبور ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص تکلیف دہ خبر دینے والا ہو، ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لئے یہ موسیقی بارِ خاطر ہی ہوگی۔

بعض نوجوان بار بار فون کرکے دوسروں کی گھنٹیاں بجا کر پریشان کرنے کے واقعات سننے میں آتے ہیں، ایسی بھی شکایتیں سنی جاتی ہیں کہ فون پر گالی گلوج کیا جاتا ہے، فحش باتیں کی جاتی ہیں، دھمکیاں دی جاتی ہیں اور دوسروں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں سخت ناپسندیدہ اور گناہ ہیں، یہ نہ صرف اسلام کے خلاف ہیں بلکہ عام تقاضۂ اخلاق کے بھی مغائر ہیں اور گناہِ بے لذت بھی، جن سے خود کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

فون ایسی طاقت ہے جس کی اجرت ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے فون پر مختصر اور ضروری باتیں کرنا چاہئے، غیر ضروری اور طویل گفتگو کرنا اسراف اور فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کو اسلام نے جس ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہ ظاہر ہے۔ آپ ﷺ نے خوش کلامی کو پسند فرمایا ہے، اس لئے کسی متعارف شخص کو فون ہو یا غیر متعارف شخص کو، نرم گفتگو کرنی چاہئے، جس سے مخاطب مانوس ہو، اکھڑ پن اور درشتگی نہ ہو، اپنی عورتوں کو غیر محرم مردوں سے گفتگو کرنی پڑے تو اس کا خیال رہے کہ بات چیت میں لوچ اور حلاوت

کا اظہار ہو، اس سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ ایسی گفتگو پریشانہ ذہن رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتی ہے۔

ملاقات کا ادب یہ ہے کہ ملاقات کے اختتام پر دوبارہ سلام کیا جائے، یہی آپ ﷺ کی سنت ہے، لہٰذا فون پر بھی گفتگو کا اختتام سلام ہی پر ہونا چاہئے، تاکہ اس سنت پر عمل ہو سکے، غرض فون ایک بڑی نعمت ہے، لیکن اگر اس کے استعمال میں شرعی حدود و آداب کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو اسی قدر باعث زحمت بھی ہے۔

(۱۳ / نومبر ۱۹۹۸ء)

تہذیب کے نام پر بد تہذیبی

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سی برائیوں کا مہذب اور شائستہ ناموں سے ارتکاب کریں گے، شراب پئیں گے لیکن اس کے نام بدل دیں گے، سود کھائیں گے اور اس کا نام بیع رکھ دیں گے، درحقیقت یہ برائی کی سب سے بدترین شکل ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں بھلائی کے نام سے برائی کی جاتی ہے، تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کو روا رکھا جاتا ہے، آزادی کے نام پر نفس کی غلامی کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ اسلام جس وقت اس دنیا میں آیا، اس وقت بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی، عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل کہتے تھے، لیکن پوری طرح شرک میں ملوث تھے، بہت سے لوگ مرد و عورت بے لباس ہو کر کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے، اور اسے نیکی تصور کرتے تھے، کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کیا ہے، ان میں کیوں کر طواف کیا جائے، اہل مکہ اپنے امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے میدان عرفات نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، حدود حرم سے باہر کیسے جائیں۔

جب کوئی انسان یا گروہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے، اور جو مقتضائے نفس کو روا رکھتا ہے، اس کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے، وہ بدی کو نیکی اور برائی کو بھلائی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، مغربی تہذیب نے آج یہی صورت اختیار کر رکھی ہے، آج بہت سی مسلم اخلاقی برائیاں، تہذیب و ثقافت کے نام پر روا ہو گئی ہیں، جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور اسے برا جانتے ہوں ان کو تہذیب نا آشنا اور متشدد سمجھا جاتا ہے، اور آج کل تو ایسے لوگ بنیاد پرست اور انتہا پسند بھی کہے جاتے ہیں، اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ طوعاً یا کرہاً مغربی ثقافت کو اہل مشرق پر مسلط کر دیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''یوم عاشقاں'' کا جشن ہے، جو ۱۴/ فروری کو منایا جاتا ہے،

مغربی ممالک میں تو مدت سے اس کی رسوم منائی جاتی تھی، ہندوستان میں لوگ اسے کسی مہذب قوم کے خرافات کی طرح واقعہ عبرت کے طور پر ذکر کیا کرتے تھے؛ لیکن عالمیانہ کی نئی اصطلاح کے تحت مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی جو یلغار شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں اب ہندوستان میں بھی آوارہ خیال لوگوں کے لئے یہ ایک محبوب دن بن گیا ہے۔ سنا ہے کہ اس مناسبت سے ایک دوسرے کو بھیجنے کے لئے فحش مضامین اور فحش تصویروں کے کارڈ چھپ رہے ہیں، خاص اس مناسبت سے کیک بنائے جارہے ہیں، اگر اس حیا سوز سلسلہ کو روکا نہیں گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بداخلاقی کی اشاعت و ترویج کا باعث ہوا ذریعہ بن جائے گا، اور معاشرہ پر نہایت ہی منفی اثرات مرتب ہوں گے، پھر ہمیں اس تہذیب کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا جس میں انسان کو اپنے جسم پر لباس بھی بوجھ محسوس ہونے لگے، جس میں نکاح کے بندھن سے انسان کو اپنی آزادی مقید ہوتی نظر آتی ہے، اور جس میں ہوس پرستی کی لہریں شرافت و اخلاق کے ساحل سے ٹکرا رہی ہیں؛ کیا ہم اپنے مشرق میں اور ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں جہاں مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی عفت و عصمت کو انسانی جوہر سمجھتے ہیں، اور جن کے نزدیک سیتا کا سب سے بڑا وصف ان کی حیا اور پاکدامنی تھی، دین و اخلاق اور شرافت و حیاء سے آزاد ثقافت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

اسلام نے حیاء کو کس قدر اہمیت دی ہے؟ کہ اسے ایمان کا ایک جز قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیاء بہر صورت خیر و بھلائی ہے: الحیاء شعبة من الایمان (مسلم حدیث نمبر ۵۷) حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حیا بہر صورت خیر و بھلائی ہے: الحیاء خیر کله (ابوداؤد حدیث نمبر ۴۷۹۶) حضرت ابو مسعودؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس شخص کو حیاء نہ ہو وہ کسی بھی برائی کا مرتکب ہو سکتا ہے اذا لم تستحي فافعل ما شئت (ابوداؤد حدیث نمبر ۴۷۹۷) حیا دراصل انسان کو برائی سے باز رکھنے اور نیکی کی طرف لے جانے والی طاقت ہے۔

حیاء ہر معاملہ میں مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ کو اگر کوئی ایسا مسئلہ بیان کرنا ہوتا جو

مرد و عورت کے جنسی معاملات سے متعلق ہوں تو اس کے لئے بہت ہی پروقار تعبیر اختیار فرماتے، خواتین کو اگر ایسا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو ازواج مطہرات کے واسطے سے دریافت کرتیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مذی یعنی وہ مادہ جو جنسی ہیجان کے وقت انسان کے جسم سے نکلتا ہے، اور جس کی نوبت جنسی اتصال سے پہلے پیش آیا کرتی ہے، کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کرنا تھا، تو چوں کہ حضرت فاطمہ صاحبزادی رسول آپ ﷺ کی زوجیت میں تھیں، اس لئے مارے حیاء کے آپ ﷺ سے دریافت نہیں کرسکے، اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے استفسار کروایا۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے آپ ﷺ کی حیاء کا عالم یہ تھا کہ کبھی کسی غیر محرم کے ساتھ آپ نے تنہائی اختیار نہیں فرمائی، عورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حیاء کا عنصر زیادہ رکھا ہے، اور یہ ان کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہے، اسی لئے ان کے لئے پردہ کے احکام رکھے گئے، ساتر لباس کو مردوں اور عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا، نماز میں خواتین کی صف پیچھے رکھی گئی، نکاح میں کنواری لڑکی کے لئے خاموشی کو رضامندی قرار دیا گیا، اور زبان سے اظہار ان کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا، میاں بیوی کو ہدایت دی گئی کہ وہ خلوت کی باتوں کو لوگوں سے مخفی رکھیں، اور انہیں دوسروں کے سامنے زبان پر بھی نہ لائیں، لباس و پوشاک، آواز، چال ڈھال، گفتگو، غرض تمام امور میں تقاضۂ حیاء کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی۔

افسوس کہ لوگوں نے محبت کے لفظ کو بھی بدنام کردیا ہے، اور بے شرمی اور بے غیرتی کو محبت جیسا باعزت نام دے دیا ہے، محبت بے غرض اور پاکیزہ چاہت کا نام ہے، جس چاہت کا مقصد نفس کی آگ کو مزید فروزاں کرنا اور بے لگام خواہشات کی پیاس بجھانا ہو وہ بے غرض چاہت نہیں ہے، جو چاہت محض ہوسِ نفس کی تکمیل سے عبارت ہو، وہ تو پاکیزگی سے نا آشنا ہے، اسلام دین محبت ہے، اس نے ہر شئی سے محبت کا سبق دیا ہے، خدا سے محبت، خدا کے رسول ﷺ سے محبت، ہر مسلمان اور ہر انسان سے محبت، اللہ کی ہر مخلوق سے

دولت کمانے، حسن و جمال سے مزہ چکھنے میں، جن میں وقتی تو تسکین ہے، جس میں انسان کو ایک کربناک بڑھاپے سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں بے غرض محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں، جہاں ایک مرد یا عورت ساتھی سے زیادہ قریب رہنے والے ساتھی کے بارے میں بھی یہ اطمینان نہیں رکھتا کہ اس کی محبت اس کے لئے وقف ہے، وہاں کی وفاداریاں اٹوٹ اور ناقابل یقین ہیں۔

کیا ہم مذہب کی گرویدہ حیا و وفا کی پرستار اور بے غرض محبت کی ترجمان کی سرزمین میں حیا و اخلاق سے آزاد اس تہذیب کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔

(۹ فروری ۲۰۰۲ء)

انتظام نہ کیا ہوتا کہ خلیفۂ کائنات حضرت انسان کی تعداد تو روز بروز بڑھتی جائے، لاکھ سے کروڑ اور کروڑ سے ارب ہو جائے لیکن ان کے لئے رزق کے وسائل اس نسبت سے کم ہوتے جائیں گے تو آخر یہ کیا کھائیں گے اور کیوں کر اپنی ضروریات پوری کر لیں گے؟۔

نہ کوئی صاحب ایمان ایسا سوچ سکتا ہے اور نہ کوئی صاحب عقل اس پر یقین کر سکتا ہے، قرآن مجید نے خوب کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں، لیکن وہ اس میں سے ایک متعین مقدار انسان کو عطا فرماتے ہیں، "وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ" (الحجر: ٢١) یعنی جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ وسائل بھی بڑھاتے جاتے ہیں۔ جب ایک معمولی سربراہ خاندان اپنے افراد خاندان کی فکر رکھتا ہے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ان کی خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے، تو کیا خدائے حکیم و خبیر اپنی مخلوق سے غافل رہ سکتا ہے، جو اسی کے حکم و اشارہ سے دنیا میں آئی ہے؟۔

کوئی بھی شخص دنیا میں افرادی قوت میں اضافہ اور زمین کی پیداوار میں اضافہ کے تناسب کو دیکھے تو وہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی گراں قدر تالیف "ضبط ولادت" میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ برطانیہ کے ایک تجزیہ نگار نے ١٨٩٨ء میں چیلنج کیا تھا کہ افزائش آبادی میں کثرت اور وسائل پیداوار کے محدود ہونے کی وجہ سے تیس سال میں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ لوگوں کو اپنی ضروریات کے لئے گیہوں نہیں مل سکے گا، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس کے بعد کئی تیس سال گزرے اور گیہوں کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعض ملکوں کو قیمت پر کنٹرول رکھنے کے لئے فاضل گیہوں نذر آتش کرنے پڑے یا سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔

کرۂ ارض کی وسعت کے اعتبار سے انسانی آبادی کا حال یہ ہے کہ فی مربع کیلو میٹر صرف اکیس افراد کا اوسط ہوتا ہے اور زمین پر انسانی آبادی کی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہالینڈ میں فی مربع کیلو میٹر ٣٢٥ آدمی تمام سہولتوں کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔ جاپان میں یہ تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ گویا موجودہ آبادی کی کئی گنی

سیلاب، قحط، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کا ابلنا، آسمانی بجلی، وبائی امراض کا پھیلنا، ٹرین اور ٹریفک کے حادثات۔ یہ اور اس طرح کے کتنے ہی قدرتی اسباب ہیں جن میں ہر سال لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور انسان خود اپنے ہاتھ سے آفت کا جو سروسامان کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے، وہ ان سب سے سوا ہے، پہلی جنگ عظیم میں روس کو چھوڑ کر صرف یورپ میں دو کروڑ چھیاسی لاکھ افراد کی موت ہوئی، صرف جرمنی میں تیس لاکھ افراد جنگ میں کام آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی ایک [illegible] پایا گیا ہے اور اب انسان نے جس طرح حرب کے ہلاکت خیز اور تہلکہ انگیز ہتھیار تیار کئے ہیں، خدانخواستہ اگر تیسری جنگ عظیم ہو جائے تو معلوم نہیں کتنے انسانوں کا خون [illegible] کیا صورت ہوگی؟ اسی طرح قدرتی طور پر نسل انسانی کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ ہر سال ایسے ہی موذی حادثات اور واقعات کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہے، جو اپنے خاموش ہاتھوں سے نسل انسانی کی تحدید کرتی رہی ہے۔

جن ملکوں اور قوموں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اس نسخہ کو آزمایا ہے، وہ اس کے مضر پہلوؤں کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، افرادی وسائل کی کمی، زنا اور بدکاری کی کثرت اور اس کی وجہ سے امراض خبیثہ کی بہتات، بے اولادی، بڑی عمر کے افراد ہونے کی وجہ سے زوجین میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کا فقدان اور اس کی وجہ سے طلاق کی کثرت، شرح پیدائش و تناسل کے رجحان میں کمی، یہ وہ مفاسد ہیں جن سے آج مغربی اقوام دوچار ہیں، تو کیا ہم نوشتۂ دیوار کو پڑھے بغیر انسان کی خود ساختہ خاندانی منصوبہ بندی کے بجائے خدائی منصوبہ بندی کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں؟

[۳۱ جولائی ۱۹۹۸ء]

تمباکو نوشی ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

۲۱ رفروری کے اخبار میں یہ خوش کن خبر دیکھنے کو ملی کہ حکومت آندھرا پردیش گٹکا پر پابندی عائد کر رہی ہے، کوئی بھی پان مصالحہ گٹکا کا مہر کے ساتھ اب ممنوع ہوگا، حکومت کے اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء میں 8.58 فیصد منہ کے کینسر کے مریض تھے، 2000ء میں یہ تعداد بڑھ کر 21.43 فیصد ہوگئی، جو دراصل گٹکا کی خراب عادت کا نتیجہ ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بری عادت کس طرح بتدریج معاشرہ میں سرایت کرتی جارہی ہے، اور کتنے ہی لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہی ہے۔

تمباکو خواہ کسی بھی صورت میں ہو، صحت کے لئے سخت نقصان دہ اور مضرت رساں ہے۔ عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ہر سال تمباکو خوری کی وجہ سے تقریباً ۴۰ لاکھ افراد کی اموات واقع ہو جاتی ہے، جن میں ۲۰ لاکھ اموات کا تعلق ترقی یافتہ ممالک سے ہے، یہ بیسویں صدی کے دسویں دہے کے وسط کی رپورٹ ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تمباکو نوشی کا یہ رجحان باقی رہا تو ۲۰۲۵ء تک دنیا بھر میں سالانہ ایک کروڑ اموات ہو سکتی ہیں، یہ ایسا بھیانک خطرہ ہے جو کسی خون ریز جنگ کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء امریکہ کی سرزمین سے ہوئی ہے، ۱۵ ویں صدی کے اخیر میں کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، وہاں کولمبس نے سب سے پہلے اصل امریکی باشندوں جن کو اس نے ریڈ انڈین کا نام دیا، کو تمباکو پیتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے لوگ اس سے قطعاً ناواقف تھے، پھر یہ پودا امریکہ سے اسپین اور پرتگال پہنچی، پرتگال سے اس نے فرانس کا سفر طے کیا، اور فرانس نے اس کی کاشت کو فروغ دینے اور اسے مقبول عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا، یورپ ہی کے ذریعہ ایشیا تک اس کی رسائی ہوئی، اور اس وقت تقریباً سو ممالک میں تمباکو کی باضابطہ

کاشت کی جاتی ہے۔

چین اور امریکہ کے بعد تمباکو کی سب سے زیادہ کاشت ہمارے ملک ہندوستان ہی میں ہوتی ہے، حکومت کو تمباکو کے ٹیکس سے سالانہ ایک عرب پچاس کروڑ ڈالر ملتے ہیں، ایک اندازہ کے مطابق ہمارے ملک میں ۴۵ کروڑ کیلو گرام تمباکو پیدا کیا جاتا ہے، اس میں سے نصف مقدار برآمد کردی جاتی ہے، اور باقی ہندوستان ہی میں مختلف صورتوں میں استعمال کی جاتی ہے، ۱۵ لاکھ کسان تمباکو اگاتے ہیں، ۲۰ لاکھ تمباکو فارم ہیں، جس میں ۵۰ لاکھ افراد کام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء جنوب کے علاقے سے ہوئی، کیوں کہ انگریز ہندوستان میں اسی طرف سے داخل ہوئے تھے، ایک صاحب علم اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی بمبئی، مدراس، گور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، تاریخ میں درج ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا، اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمالی مشرقی ہند میں پھیلا (خواص تمباکو: ۱۳، ۲۳)

تمباکو خوری کی خو ایسی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہے کہ زمانۂ قدیم میں لوگ تمباکو کی مضرتوں سے واقف نہ رہے ہوں، تمباکو کی تاریخ جتنی قدیم ہے تمباکو کی مضرت کا احساس بھی اسی قدر قدیم رہا ہے، سرکاری طور پر اس کے مضر صحت ہونے کا اعلان پہلی دفعہ ۱۶۰۴ء میں فرماں روائے برطانیہ جیمس اول نے کیا، اور پھر اس کے نقصانات دن بدن لوگوں پر واضح ہوتے چلے گئے، ۱۸۵۹ء میں فرانس کی ایک رپورٹ سامنے آئی جس میں ایک ہسپتال میں کینسر کے مریضوں کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں جس کے مطابق ہونٹ، گلے اور منہ کے کینسر کے کل مریضوں کی تعداد ۹۶ تھی، اور یہ بھی تمباکو کو استعمال کرنے والے لوگ تھے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سگریٹ نوشی میں بہت اضافہ ہوگیا، اور اس عادت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ۱۹۶۴ء میں امریکہ کی ایک تنظیم کی جانب

پھر اس سے انسان کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں، نہ اس سے بھوک ختم ہوتی ہے، نہ اس سے دل و دماغ کو جلاء حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی حصۂ جسم کو اس سے کوئی نفع پہنچتا ہے، اور اس مضرِ صحت شئی کی وجہ سے انسان اپنی گاڑھی کمائی اس بے فائدہ کام میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے، اس لئے یہ خرچ یقیناً فضول خرچی میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی کو منع فرمایا ہے "ولا تسرفوا" (الانعام: ۱۴۱) بلکہ فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا "ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین" (الاسراء: ۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے ہر ایسی چیز سے منع فرمایا ہے، جو انسان کو نشہ میں مبتلا کرنے والی، یا اس کے جسم کو کمزور اور اس کی صحت کو متاثر کرنے والی ہو: "نھی رسول اللہ ﷺ عن کل مسکر و مفتر" (الحدیث) گٹکھا بھی یقیناً مفتر چیزوں میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو مضرت رساں ہو، خواہ اس کی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے۔ "لا ضرر و لا ضرار" گٹکھا اور سگریٹ وغیرہ خود اس کے لئے ضرر رساں ہے اور اس کا دھواں دوسروں کو بھی نقصان میں مبتلا کرتا ہے۔

اسی لئے بعض فقہاء نے تمباکو کو حرام اور بعض نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ رقمطراز ہیں:

"وکذا تحرم حورۃ الطیب و کذا الدخان الذی شاع فی زماننا ولاسیما بعد نھی ولی الامر نصرہ اللہ"۔

(الدر المختار مع رد المحتار: ج ۲، ص ۲۴۶، کتاب الاشربہ)

"اسی طرح گانجا اور تمباکو جو ہمارے زمانہ میں عام ہو گیا ہے، حرام ہے، خاص کر سلطان (اللہ اس کی مدد کرے) کی طرف سے ممانعت کا فرمان جاری ہونے کے بعد۔"

گو اکثر علماء احناف نے اور ہندوستان میں ماضی قریب کے اہل علم نے تمباکو کو مباح یا صرف مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، لیکن ایسا اس وجہ سے کہ تمباکو کے استعمال کی متوسط صورتیں، اس میں پائے جانے والے زہرناک اجزاء اور صحت کے لئے اس کا شدید

مضرت رساں ہوتا، ان حضرات کے سامنے غالباً نہیں آپایا تھا، نیز گٹکھے کی مضرت اور اس کی وجہ سے منہ میں کینسر کا پیدا ہونا، اور ہونٹوں کی وضع کا بگڑ جانا ایک عام مشاہدہ ہے، اس لئے اس کو خبائث میں شمار کیا جانا چاہئے، جو لوگ گٹکھے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اپنے اس عمل کو اپنے بزرگوں کی نظر سے چھپاتے ہیں اور مہذب و شائستہ مجالس میں اس کے ارتکاب سے گریز کرتے ہیں، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ سلیم طبیعتوں کے لئے یہ ایک ناگوار شئی ہے۔

اس لئے گٹکھا اور اس طرح کے مضرت رساں تمباکوئی مصنوعات کو یوں تو حرام ہونا چاہئے، لیکن اگر از راہِ احتیاط حرام نہ کہا جائے، تو یہ مکروہ تحریمی اور قریب بہ حرام ضرور ہیں، حکومت کا یہ اقدام خوش آئند اقدام ہے، ہمیں اس کو سراہنا چاہئے، جو لوگ اپنے آپ کو ملک و قوم کے بہی خواہ اور محب وطن کہتے ہیں، ان کو لوگوں میں نفرت کی سوداگری کرنے کے بجائے ایسی چیزوں کے خلاف مہم جوئی کرنی چاہئے، اور سماج میں انسانوں سے نفرت کے بجائے مہلک انسانیت چیزوں سے نفرت کی تعلیم دے، تو یہ وقتی حب الوطنی کا صحیح ثبوت ہوگا۔

(۲ مارچ ۲۰۰۲ء)

چائے میں خون کی آمیزش

جام و مینا اور بادۂ و ساغر ہمیشہ شاعروں کا محبوب اور ممدوح رہا ہے اور اکثر شعراء اس کے اسیر زلف رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مرتے مرتے بھی ہمارے شاعروں کو شراب و کباب کی یاد ستاتی رہتی تھی، چچا غالب تو کہہ گئے ہیں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہاں تک کہ جو لوگ دہن سے شراب کو نہیں لگاتے تھے وہ بھی اپنی شاعری کو ضرور ہی اس سے خمار آلود کرتے تھے، جب ہی تو ریاض خیر آبادی جیسے زاہد مزاج شاعر کے یہاں بادۂ و مے کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے، ہنس کہنے والے تو کہتے ہیں کہ:

جنتی شیخ ہے ساغر و مینا کے بغیر

یہاں تک کہ مرزا حالی کو اردو شعراء سے گلہ کرنا پڑا کہ ان کی شاعری تاڑی کی دکان ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "رندانِ خوش مذاق" کو چائے کی طرف کم توجہ ہوئی، کم سے کم اردو شعراء کے دیوان میں شاید ہی چائے کے بارے میں پانچ دس اشعار بھی مل سکیں، کیوں کہ اس میخانہ میں شراب طہور کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تھی، ایک ملحد شاعر نے چائے پر کچھ کہا بھی تو اس کو بھی "الحاد" سے آلود کر کے کہ:

وہ تو کہیے عرب میں چائے نہ تھی
ورنہ وہ بھی حرام ہو جاتی

لیکن لگتا ہے کہ شاعر کا یہ اندیشہ اب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے!

اس خبر نے یقیناً چائے پینے، پلانے اور بیچنے اور خریدنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا ہوگا کہ بعض کمپنیاں چائے کو خوش رنگ بنانے کے لئے اس میں خون اور گوشت کے ریشے

جز بن جاتی ہے، بعض صورتوں میں اس کا خارجی استعمال تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کھانے پینے کی اشیاء میں کسی حرام کا استعمال درست نہیں۔ خنزیر کے بارے میں اصولی تصور یہ ہے کہ وہ سراپا نجاست ہے، اس کے کسی جزء کا جسم کے خارجی حصہ میں بھی استعمال کرنا اضطراری کیفیت کے بغیر جائز نہیں۔

پھر چائے ایسی جاذب شئی ہے، جس میں سیال مادہ کو جذب کرنے کی بہت صلاحیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون چائے میں ملا دیا جائے تو چائے اسے جذب کر کے پوری طرح سمو لیتی ہے، ایسی جذب کی صلاحیت رکھنے والی شئی میں اگر کوئی ناپاک چیز مل جائے، تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے پاک کرنے کی کوئی صورت نہیں، اور بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اسے تین بار پانی میں ابالا یا پکایا جائے، اور ہر بار پانی کے سوکھ جانے سے پہلے خشک کر لیا جائے، تب ہی وہ پاک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر چائے کو اس مرحلہ سے تین بار گذارا جائے تو کیا اب اس میں خوش ذائقی اور خوش رنگی باقی رہے گی؟ فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کا ملتا ہے، جس سے چائے کے مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"ثم قال سيدي عبد الغني و هذا بخلاف المصبوغ بالدم كالثياب الحمر التي تجلب في زماننا عن ديار بكر فلا تطهر ابدا ما لم يخرج الماء صافيا و يعفى من اللون."

[ردالمحتار ۱، ۲۲۳]

"میرے بزرگ شیخ عبدالغنی نے فرمایا کہ یہ صورت اس صورت کے برخلاف ہے جب کہ کوئی چیز خون میں رنگی جائے، جیسے وہ سرخ کپڑے جو ہمارے زمانہ میں دیار بکر کے علاقے سے لائے جاتے ہیں، کہ جب تک اس کپڑے سے صاف پانی نہ نکلنے لگے، اور رنگ سے بالکل خالی نہ ہو جائے، وہ کپڑے قطعاً پاک نہیں ہو سکتے"

اس لئے حاصل یہی ہے کہ چائے میں اگر اس طرح کی کوئی ناپاک شئی مل جائے،

ہو شرعاً وہ ناقابلِ استعمال ہے۔

بحث کا ایک دوسرا پہلو بھی ہو سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی شی میں تغیر کی دو صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے دوسری چیز کے ساتھ مل جائے، اور دونوں خلط ملط ہو جائیں، اس صورت میں اس شی کا حکم باقی رہتا ہے، مثلاً پانی میں پیشاب مل جائے تو پیشاب کے اجزاء پانی کی تھوڑی مقدار میں اپنے اثرات کے ساتھ باقی رہتے ہیں، اس لئے پیشاب کا حکم باقی رہے گا، اور وہ ناپاک ہی سمجھا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ شی اپنی حقیقت کو کھو دے، اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے، جیسے گوبر آگ میں جلایا جائے اور راکھ ہو جائے، کسی نشہ آور مشروب میں نمک ڈال کر اسے سرکہ بنا دیا جائے، اور نشہ پیدا کرنے کی جو کیفیت اس مشروب میں تھی جس سے اس کی شناخت اور پہچان تھی، وہ کیفیت ہی مفقود ہو جائے، تو یہ کیفیت حقیقت کی تبدیلی سے عبارت ہے، اس لئے اس میں حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا گوبر ناپاک ہے اور اس کی راکھ پاک، نشہ آور مشروب ناپاک ہے اور اس کا بنا ہوا سرکہ پاک اور حلال۔

چائے میں اگر خون ملایا جائے تو اس سے خون کی حقیقت اور ماہیت بدل نہیں جاتی، بلکہ وہ اپنے خواص کے ساتھ باقی رہتا ہے، کیونکہ چائے کے رنگ اور ذائقہ پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اس پہلو سے بھی ایسی چائے ناپاک اور حرام ہی ہوگی۔

وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں بعد تائیوان چائے کی جانب سے یہ وضاحت آگئی کہ خون کی آمیزش اور حکومت کی جانب سے اس کی اجازت کا تعلق صرف بین الاقوامی کمپنیوں سے ہے، نہ کہ ملکی کمپنیوں سے، اس خبر نے یقیناً چائے پینے والوں کو سہارا دیا ہوگا، اور ایک حد تک انہیں اطمینان ہوا ہوگا۔ فقہی نقطۂ نظر سے جب صاحب معاملہ خود کوئی اطلاع دے، یعنی بیچنے والا اپنے سامان کے بارے میں حلال و جائز ہونے کی خبر دے تو اس کی خبر معتبر ہوگی، اور اس پر اعتماد کرنا درست ہوگا، اس پس منظر میں ایسی کمپنیوں کی چائے استعمال کی جا سکتی ہے۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہم ہیں، اول یہ کہ چائے کے بارے میں اس

دستخط ــــــ اسلامی احکام

"دستخط" کے اصل معنی ہاتھ کی تحریر کے ہیں، لیکن اصطلاح میں دستخط کرنا اپنا نام لکھنے کو کہتے ہیں۔ نام لکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سادہ طریقہ پر اپنا نام تحریر کر دیا جائے، جس کی نقل دوسروں کے لئے دشواری کا باعث نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس انداز پر نام لکھا جائے کہ اس کی نقل ایک گونہ دشوار ہو، گویا یہ ایک خاص تحریر ہے، جو دستخط کرنے والے کی جانب سے کسی بات کی تصدیق و توثیق کو ظاہر کرتی ہے، ایسی ہی تحریر کو عرف عام میں "دستخط" کہتے ہیں۔

ایک زمانہ میں اس مقصد کے لئے مہر (Stamp) کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ یہ مہر انگوٹھی میں بنائی جاتی تھی، ممکن ہے کہ انگوٹھی میں مہر بنانے کا مقصد اس کی حفاظت ہو، کیوں کہ انگوٹھی ہر وقت آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اسے چوری کرنا آسان نہیں، اسی لئے عربی زبان میں انگوٹھی کے لئے خاتم کا لفظ معروف ہو گیا، حالاں کہ "ختم" کے اصل معنی مہر لگانے کے ہیں اور قرآن میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (البقرۃ: ۷) صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان ایک محدود مدت کے لئے ناجنگ معاہدہ ہو گیا، اور آپ ﷺ کو دعوت اسلام کی طرف یکسوئی سے ساتھ توجہ کا موقع ملا تو آپ ﷺ نے شاہان عجم اور رؤسا عرب کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ اس موقع سے بعض حضرات نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ حضرات مہر کے بغیر خطوط کو قبول نہیں کرتے، چنانچہ آپ ﷺ نے مہر بنوائی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ کیا گیا اور آپ ﷺ نے کمال احترام کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے "محمد"، اس کے اوپر "رسول" اور سب سے اوپر "اللہ" کے کلمات لکھے۔ (بخاری: ۵۸۷۸)

آپ ﷺ کا یہ عمل گویا دستخط کی اصل ہے۔ دستخط کا مقصود چوں کہ کسی تحریر کے تشخص

اور اعتماد کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے اور مذکورہ شخص کی طرف اس کی نسبت قابل اعتماد و اعتبار ہے، اس لئے دستخط ایسا کرنا چاہئے جس کی نقل ایک حد تک مشکل ہو اور اس کی تحریر کا تشخص محفوظ رہے، کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو بد قماش لوگ اس کے مصنوعی دستخط کا سہارا لے کر تلبیس اور دھوکہ دہی سے کام لے کر دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ البتہ دستخط اتنا غیر واضح اور پیچ در پیچ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ صاحب دستخط کا نام ہی معلوم نہ ہو سکے اور پہلے سے نام معلوم نہ ہو تو دستخط میں اس نام کو سمجھنا دشوار ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس بات سے منع فرمایا تھا کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کے نقش پر لوگ اپنی انگوٹھیاں بنائیں۔ (بخاری: ۲/۸۷۳ عن ابن عمرؓ) اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے دستخط کی نقل کرنا یا اپنے دستخط کو اس سانچے میں ڈھالنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ اس شخص کو مجروح کرتا ہے، اور اس سے تلبیس اور دھوکہ دہی کا راستہ کھل سکتا ہے، بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں کہ مہر اور دستخط کی نقل کر کے کسی شخص کی طرف خلاف واقعہ بات منسوب کر دی گئی اور اس کو ظلم و جبر اور افتراء پردازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

ظاہر ہے کہ شریعت میں دھوکہ دینا سخت گناہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ دہی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے: "الخديعة في النار" (بخاری: ۱/۲۸۸ باب النجش) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جو دھوکہ دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں: "من غش فليس منا" (ترمذی: ۱/۲۴۵) اور جو چیز گناہ اور حرام کا ذریعہ ہو وہ خود بھی گناہ اور حرام ہے۔ پس دستخط کی نقل چونکہ تلبیس اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بن سکتی ہے، غلط دستخط کر کے حقوق چھینے جا سکتے ہیں، کسی شخص پر غیر واقعی ذمہ داریاں عائد کی جا سکتی ہیں اور کسی شخص کی طرف ایسی بات کو منسوب کیا جا سکتا ہے جس سے وہ بری الذمہ ہے اور جو بات کسی خلاف شرع کام کا ذریعہ بنتی ہے وہ خود بھی ناجائز ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دستخط کی نقل جائز نہیں اور اس سے خوب اجتناب کرنا چاہئے۔

دستخط سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ شریعت میں کس حد تک دستخط کا اعتبار

ہے؟ اس سلسلہ میں فی الجملہ دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے خطوط پر مہر لگائی ہے، جو دستخط کے قائم مقام ہے، اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا اور شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تو آپ ﷺ نے مہر لگانے کا اہتمام نہ فرمایا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مقدمات اور نزاعی معاملات میں بھی دستخط کو ثبوت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ یہ سوال اہم اور علماء کے غور وفکر کا محتاج ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ حدود وقصاص -- یعنی ان سنگین جرائم سے متعلق مقدمات جن کی سزائیں شریعت میں متعین ومقرر ہیں -- میں محض دستخط کی وجہ سے جرم ثابت نہیں ہوتا، اگر مطلوبہ گواہ موجود نہ ہوں یا اس نے عدالت میں اپنے جرم کا اقرار نہ کیا ہو، البتہ دوسرے معاملات بالخصوص مالی مقدمات میں دستخط بھی ثبوت کی فراہمی کے لئے کافی ہوسکتا ہے کیونکہ اسباب قضاء میں سے ایک "قرائن قاطعہ" بھی ہے (البحر الرائق: ۷؍۲۰۵) یعنی کسی واقعہ پر ٹھوس اور واضح علامتوں کا موجود ہونا، دستخط بھی ایسی ہی علامتوں میں سے ہے۔

فقہاء کے یہاں بھی ہمیں اس سلسلہ میں بعض نظائر ملتی ہیں، تحریر کس حد تک کسی معاملہ کے ثبوت پر دلیل ہوسکتی ہے؟ اسلام کے عدالتی نظام میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے (دیکھئے تبصرۃ الحکام ۱؍۳۶۵) اور فی الجملہ تحریر کو بھی ثبوت کا ایک ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے، اس سے "دستخط" کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر دستخط سے قاضی کو اس تحریر کے درست ہونے کا بھروسہ ہوجائے اور ایسی وجوہ موجود ہوں جو اس تحریر کے معتبر ہونے کا تقاضا کرتی ہوں تو دستخط کی وجہ سے وہ دستاویز اور اقرار نامہ معتبر ہوگا، اسی لئے قرآن مجید نے دین کو لکھ لینے کا حکم دیا ہے (بقرہ: ۲۸۲) اگر تحریر کی اہمیت نہیں ہوتی تو اس حکم کا کوئی معنی نہیں، اور جب عام تحریر بھی معتبر ہے تو دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، اسی لئے اسلام کے قانون قضاء کے مشہور عالم قاضی ابن فرحون مالکی (۷۹۹ھ) نے وثیقہ یعنی دستاویز کی شہادت کی اساس پر فیصلہ کرنے کا ذکر کیا ہے (تبصرۃ الحکام فصل القسم الثانی فی الخط ۱؍۳۶۲-۳۶۳) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسی تحریریں جو دستخط سے مزین ہوں شرعاً معتبر ہیں الا یہ کہ اس میں تلبیس

پڑھے جانے کی کوئی قوی وجہ موجود نہ ہو۔

دستخط کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس بات کی تصدیق مقصود ہو اس کے نیچے دستخط کیا جائے، اسی طرح خطوط و مراسلات میں بھی لکھنے والے کو اپنا دستخط نیچے کرنا چاہئے، جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات میں نیچے مہر لگائی ہے۔ دراصل دستخط اور مہر کا مقصود سلسلۂ کلام کو وہاں ختم کرنے کے ہیں اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آگے اس میں جو کچھ اضافہ ہوگا وہ صاحب تحریر کی طرف سے تصدیق شدہ نہیں ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے اختتام کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید میں "خاتم النبیین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (الاحزاب: ۴۰)

جو حکم دستخط کا ہے قریب قریب وہی احکام نشان انگوٹھا، مہر اور لیٹر پیڈ کے بھی ہیں، البتہ مہر اور لیٹر پیڈ میں بہ مقابلہ دستخط کے جعل سازی اور دھوکہ دہی کا امکان زیادہ ہے، کیوں کہ ان کی نقل آسان ہے، اس لئے تجارتی اعتبار سے بھی ان کا درجہ دستخط سے کم ہے۔ نشان انگوٹھا میں دھوکہ دہی کا امکان بہت کم ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے انگوٹھے کے نشانات کو دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، بلکہ انسان اس معاملہ میں دوسرے کی نقل کرنے پر قادر نہیں، اس لئے یہ زیادہ قابل بھروسہ ہے۔ اسی لئے یہ بات بہتر ہے کہ اہم معاملات کی دستاویزات پر دستخط کے ساتھ ساتھ نشانِ انگوٹھا بھی لے لیا جائے۔

آدمی کا ہر عمل اس کے مزاج و مذاق کا آئینہ دار ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص تیز تیز چلتا ہو تو یہ اس کے عجلت پسند ہونے کی علامت ہے، کوئی شخص اپنی مونچھیں اونچی رکھتا ہو تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مزاج میں عجب اور تکبر ہوگا، چال ڈھال، گفتار، رفتار اور نشست و برخاست کی طرح آدمی کی تحریر بھی اس کی اندرونی کیفیت کی غماز ہوتی ہے۔ اسی لئے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ آدمی کا دستخط بھی اس کی اندرونی کیفیت اور صلاحیت کا عکس ہے۔ بعض لوگ اپنے دستخط اس طرح کرتے ہیں کہ گویا پھول بنا رہے ہیں، بعض لوگوں کا دستخط تلوار یا کسی ہتھیار کے مماثل ہوتا ہے، بعض دستخط بہت پیچ دار ہوتے ہیں، بعض ایسے جن سے کوئی بامعنی نام سمجھا جا سکے اور بعض سیدھے سادے کہ گویا عام طریقہ پر

نام لکھا دیا گیا ہو۔ یہ آدمی کے احساساتی ذوق، حلم یا غضب، فکر وعمل کی صداقت یا تذبذب، ذہانت وغباوت کی کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن دستخطوں کے ذریعہ کسی شخصیت کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا دشوار ہے، کیوں کہ اکثر اوقات لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کے دستخط کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اسی کو اختیار کرتے ہیں، گویا یہ ان کا طبعی اور دستخط نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک طرح کی نقل ہے۔ ظاہر ہے اس کو دستخط کرنے والے کی اپنی اندرونی کیفیت کا مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے محض دستخط کو کسی شخص کے مزاج اور صلاحیت کو سمجھنے کا ذریعہ تصور کرنا درست نہیں کہ اس سے بدگمانی اور غلط فہمی کا دروازہ کھل سکتا ہے اور کسی مسلمان بلکہ بلاوجہ کسی انسان سے بھی "سوء ظن" درست نہیں۔

(۲۳/ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

قرض ——— فضائل و مسائل

اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں اپنے بندوں کے درمیان فرق رکھا ہے، اور یکسانیت نہیں برتی ہے، یہی نابرابری ہے جس سے کائنات کا نظام جاری و ساری ہے، اگر یہ نابرابری نہ ہوتی تو نہ کوئی شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کا خواہاں ہوتا، اور نہ کسی سرمایہ دار کو کوئی مزدور اور کاریگر ہاتھ آتا۔ یہی احتیاج اور ضرورت بعض وقت انسان کو قرض کے لین دین پر مجبور کرتی ہے، اگر چہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اہل ثروت اپنے غریب بھائیوں کو قرض دے دیں تو خود قوم و سماج کا راحت بخش ہو جائے، افسوس کہ اب تو مسلمانوں میں یہ جذبہ اور اسپرٹ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے زائد از ضرورت مال میں دوسرے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں، اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کریں، ضرورت ہے کہ لوگ قرض کے احکام و مسائل ہی سے واقف ہوں۔

قرض کے لین دین کا ثبوت قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی، نیز اس پر اجماع و اتفاق بھی ہے اور مصلحت زمانی کا تقاضا بھی ہے، قرآن نے اللہ کے راستہ میں خرچ کو "قرض حسن" قرار دیا ہے، (البقرۃ: ۲۴۵) اس میں قرض کے پسندیدہ، مستحب اور مطلوب ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، ایک جگہ "دین" کے ساتھ مدت لکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۸۲) دین کا لفظ عام ہے اور قرض بھی اس کے دائرہ میں آتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ارشاد نبوی ﷺ نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوبار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے (سنن ابن ماجہ: ۲۴۳۰، ابن حبان: ۵۰۴۰ مع تحقیق الالبانی) اور بھی متعدد روایتیں ہیں جن میں قرض دینے کی فضیلت وارد ہے، اس لئے اس کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے (المغنی ۴/۲۰۴) پھر قرض ایک انسانی مصلحت ہے، کہ بہت سے مواقع پر اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لئے اگر اس کی

بھی بند کر دیا، مثلاً مقروض قرض دہندہ سے کوئی معمولی چیز گراں قیمت میں خریدے، یہ بھی مکروہ ہے (الدر المختار علی ہامش الرد: ۴/۱۹۵) اسی طرح یہ صورت بھی مکروہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص قرض لینے کے لئے آئے تو قرض دہندہ ساٹھ روپیہ تو اسے قرض کے دیدے اور بیس روپیہ کی چیز اسے چالیس روپیہ میں فروخت کر دے تاکہ مقروض کے یہاں اس کے سو روپیہ ہو جائیں حالانکہ مقروض کو اس سے اسی روپیہ ہی حاصل ہوگا (رد المحتار: ۴/۱۹۵)

سود خوار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور سود کے چور دروازوں کو بند کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے مقروض کی طرف سے تحائف کے قبول کرنے میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جب کوئی قرض دے اور مقروض کوئی تحفہ دے یا اپنی سواری پر بٹھائے تو اسے قبول نہ کرنا چاہئے سوائے اس کے کہ پہلے سے ان کے درمیان باہم تحائف کا لین دین رہا ہو (ابن ماجہ: ۲/۸۱۳) حضرت ابی ابن کعبؓ جہاد کی غرض سے عراق کی طرف سے جا رہے تھے تو زر بن حبیش نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں سود کا عام رواج ہے، اس لئے اگر آپ کسی کو قرض دیں اور وہ آپ کو قرض کے ساتھ کچھ تحفہ بھی دیں تو اس کا تحفہ قبول نہ کریں۔

اسی بنا پر فقہاء نے بھی مقروض کی ہدایا اور دعوتوں میں احتیاط کا حکم دیا، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے دعوت نہ دیتے رہے ہوں یا ہدایا و تحائف کا معمول نہ رہا ہو تو ایسی دعوت و تحفوں کا قبول کرنا جائز نہیں ہاں معاملۂ قرض سے پہلے سے اس طرح کا معمول رہا ہو تو اب جائز ہے (ہندیہ: ۳/۲۰۳) قریب قریب یہی رائے دوسرے فقہاء کی بھی ہے۔ (دیکھئے مواہب الجلیل: ۴/۵۴۶، کشف القناع: ۳/۳۰۵)

(۷ مئی ۱۹۹۹ء)

زکوٰۃ ـــــ کچھ نئے مسائل

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، زکوٰۃ ہر مال میں واجب نہیں، بلکہ کچھ مخصوص اموال میں ہی واجب ہے، زمین میں سے نکلنے والی معدنیات میں سے صرف سونا اور چاندی میں ہی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ تجارت کی صورت مستثنیٰ ہے، تجارت خواہ کسی بھی سامان کی کی جائے، وہ مال زکوٰۃ ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ جو موجودہ حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ بعض حضرات اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لئے نقد رقم کو ہیرے اور جواہرات کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اس تبدیلی کا مقصد گو تجارت نہیں ہوتا لیکن یہ روپیوں کی بدلی ہوئی صورت ہے، لہٰذا کیا ایسے ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ شریعت نے مخصوص اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اور یہ ان اموال میں سے نہیں ہے، جہاں تک روپیہ کی دوسری صورت میں تبدیلی کی بات ہے تو روپیہ سے زمین بھی خرید کی جاتی ہے، مکان بھی خرید کیا جاتا ہے اور دوسری اشیاء کی صورت میں بھی روپیہ کو تبدیل کیا جاتا ہے، لہٰذا پھر زکوٰۃ کے لئے کسی کا خاص مال کی تخصیص باقی نہیں رہ پائے گی، جو شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں صراحت موجود ہے کہ ہیرے جواہرات میں اسی وقت زکوٰۃ واجب ہے جب ان کو تجارت کی نیت سے خرید کیا گیا ہو، ورنہ نہیں، (عالمگیری ۱/۱۸۰) یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ ان ہیرے اور جواہرات کا مقصود روپیہ کا تحفظ

ہوتا ہے نہ کہ خود ہیرے اور جواہرات کا حصول، اس لئے گویا یہ نقد رقم ہی ہے جو ایک تبدیل شدہ صورت میں موجود ہے، لہذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔۔۔ راقم الحروف کے خیال میں پہلی رائے قوی ہے اور یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے اپنے ہیرے اور جواہرات جو استعمال کے لئے نہیں، بلکہ سرمایہ کی حفاظت کے لئے خریدے گئے ہوں، ان کی زکوٰۃ ادا کر دینا ہی بہتر ہے۔

مال سے مال حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک تجارت اور دوسرے اجارہ، تجارت یہ ہے کہ کوئی شئی کھو کر اس سے نفع حاصل کیا جائے، مثلاً: اگر دس روپیہ کا قلم بارہ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں، تو قلم سے محرومی کو گوارا کر کے اس پر دو روپیہ نفع حاصل کرتے ہیں، یہ تجارت ہے، مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے مٹی اور زمین ہی کیوں نہ ہو؟ اور کسی چیز پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کیا جائے یہ "اجارہ" ہے، جیسے مکان، گاڑی وغیرہ کرایہ پر لگائی جاتی ہے، مالک کی ملکیت ان اشیاء پر باقی رہتی ہے اور کرایہ کی صورت میں وہ اس پر نفع حاصل کرتا ہے، ایسی چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں، فتاویٰ قاضی خان میں ہے: "لــو اشتری قدوراً من صفر یمسکها ویواجرها لا تجب فیها الزکوٰۃ"

(قاضی خان ۱/۲۵۱)

یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہے جو" آلات کسب" ہیں، جیسے: سلائی مشین، پریس، کمپیوٹر، لیتھر مشین وغیرہ، کہ ان کی اصل پر زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں دوسرے سرمایہ کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(عالمگیری: ۱/۱۷۲)

"شیرز" کی اصل تو قدیم ہے، لیکن آج اس نے جو وسعت اختیار کر لی ہے، ماضی میں ایسا نہیں تھا، بعض شیرز تو خالص تجارتی نوعیت کے ہیں، یعنی ایسی کمپنیاں کے ہیں جو ایک تجارتی گروپ ہے، سامان خریدتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی منتقل کرتا ہے، ایسے شیرز میں تو زکوٰۃ واجب ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ یہ مال تجارت

ہے۔ بعض شیئرز ایسے بھی ہیں جو صنعتی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کمپنیوں کے پاس مشینیں اور آلات ہیں جن سے چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ اصولی طور پر ایسے شیئرز کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے کیونکہ یہ "آلات کسب" کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ سامان تجارت کی، صرف ان سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔ لیکن چونکہ آج کل کمپنی کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، شیئرز تجارتی مقصد ہی کے تحت خریدے جاتے ہیں، اس لئے علماء کا خیال ہے کہ "شیئرز" مطلقاً مال تجارت ہیں اور ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جن لوگوں نے اس نیت سے حصص خریدے ہوں کہ حصص کو باقی رکھتے ہوئے کمپنی سے حاصل ہونے والے نفع سے استفادہ کرنا ہے ان کو زکوٰۃ اس قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی ہوگی جو کمپنی متعین کرتی ہو، اور جن حضرات نے حصص اس مقصد کے تحت خریدے ہوں کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کر دیں گے، ان لوگوں کو موجودہ مارکیٹ قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً کمپنی کے نزدیک ایک حصہ کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے اور مارکیٹ میں 250/ روپے، تو پہلی صورت میں ۲۰۰ روپے اور دوسری صورت میں ڈھائی سو روپے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ حکم شیئرز کا ہے۔ "بونڈز" کی حیثیت قرض کے دستاویز کی ہے اور اس پر جو نفع دیا جاتا ہے وہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جتنی رقم کا بونڈ ہے، اتنی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اس پر جو نفع ملتا ہے وہ پورا کا پورا واجب التصدق ہے۔

"پراویڈنٹ فنڈ" میں تین طرح کی رقم شامل ہوتی ہے، ایک وہ جو خود گورنمنٹ تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، دوسرے وہ جو اس کے برابر حکومت اپنی طرف سے بڑھا کر ادا کرتی ہے، تیسرے وہ جو ملازم رضاکارانہ طور پر اپنی تنخواہ سے زائد رقم کٹواتا ہے تاکہ اس کی P.F کی رقم زیادہ سے زیادہ ہو سکے ___ ان میں سے وہ رقم جو حکومت جبراً کاٹ لیتی ہے اور وہ رقم جو حکومت اپنی طرف سے اضافہ کرکے دیتی ہے خواہ جبراً وضع کی ہوئی رقم پر ہو یا رضاکارانہ وضع کرائی ہوئی رقم

پر مالک کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب رقم وصول ہو جائے اور اس پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہی رائے علماء برصغیر میں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی ہے (امداد الفتاویٰ ۲: ۳۹-۴۰) کیوں کہ اجرت جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس کا پورا ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی، البتہ جو رقم اس نے خود ہی رضا کارانہ جمع کرائی ہے، چونکہ اس پر حکومت اور کمپنی کا قبضہ خود اس کے حکم سے ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اپنے نائب اور وکیل کی وساطت سے اس نے اس رقم پر قبضہ کر لیا ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

"سامان تجارت" جس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اس کی تین قیمتیں ہو سکتی ہیں، ایک وہ قیمت جس میں سامان خرید کیا گیا تھا، دوسرے وہ قیمت جس میں تاجر آج اس سامان کو خرید کر سکتا ہے، تیسرے جس قیمت میں آج وہ اس سامان کو فروخت کرے گا، مثلاً: تاجر نے ایک قلم ۸۰ روپیہ میں چھ ماہ پہلے خرید کیا تھا، اگر اس وقت خرید کرنا چاہے تو اسے ۱۰۰ روپے فی قلم کے لحاظ سے خرید کرنا پڑے گا، اور ۱۲۰ روپے فی قلم کے لحاظ سے وہ عام طور پر گاہک کو یہ قلم فروخت کرتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ اپنی دکان میں موجود قلم کے اسٹاک کی قیمت کس لحاظ سے لگا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

اس مسئلہ میں گو فقہاء کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قرین صواب امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی رائے ہے کہ جس روز زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا (مراقی الفلاح ج، ۳۹) کیوں کہ اصل میں زکوٰۃ کے طور پر خود قلم واجب ہے نہ کہ روپیہ، روپیہ قلم کے بدل کے طور پر دیا جاتا ہے، لہٰذا جتنی رقم میں اس تاجر کو زکوٰۃ میں واجب شدہ سامان حاصل ہو سکتا ہو اتنی رقم اس کے ذمہ واجب ہوگی۔ مذکورہ مثالوں کی روشنی میں اسے ۱۲۰ روپے فی قلم کے حساب سے قیمت لگانی چاہئے اور اسی لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔

سونے کا اصل نصاب ۲۰ مثقال اور چاندی کا دو سو درہم ہے، ہندوستان کے قدیم اوزان میں اس کا وزن کیا ہوگا؟ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ مروج اور

محقق قول یہ ہے کہ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ ہے، مفتی محمد شفیعؒ صاحب نے اس پر جو تحقیقی رسالہ "اوزان شرعیہ" کے نام سے تالیف کیا ہے جو "جواہر الفقہ، حصہ اول" میں شریک اشاعت ہے، وہی رائے مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۵/۶) اور مولانا احمد رضا خان بریلوی (فتاویٰ رضویہ ۴۲۵/۴) کی بھی ہے، یہ ساڑھے باون تولہ موجودہ اوزان میں ۶۱۲،۳۵ گرام اور ساڑھے سات تولہ ۸۷،۴۷۹ گرام ہوتا ہے۔

(۸ جنوری ۱۹۹۹ء)

مصارف زکوٰۃ ـــــ کچھ اہم پہلو!

اسلام کے تمام احکام کی بنیاد دو باتوں پر ہے، خالق کی اطاعت و بندگی، اور مخلوق سے محبت اور حسن سلوک۔ اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جہاں نماز خدا کی بندگی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے عبارت ہے، وہیں زکوٰۃ کا مقصد انسانیت کی حاجت روائی اور اس کی ضروریات کی تکمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عہد صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے جہاد کیا اور فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کو گوارا نہیں کر سکتا، کہ کوئی گروہ نماز تو ادا کرنے کے لئے تیار ہو لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر جائے۔

زکوٰۃ صرف محتاجوں کی اعانت ہی نہیں ہے بلکہ ایک عبادت بھی ہے، اسی لئے جیسے عبادت کی تفصیلات اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے متعین ہوتی ہیں، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی تمام تفصیلات قرآن و حدیث کی صراحتوں سے ثابت ہیں، زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط کیا ہیں؟ کن لوگوں پر واجب ہے؟ کتنی مدت گذرنے پر واجب ہے؟ اور کس مقدار میں واجب ہے؟ یہ تمام باتیں کتاب و سنت میں مذکور ہیں، اور عام طور پر فقہاء ان کے بارے میں متفق ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلق جن نکات کی وضاحت قرآن و حدیث میں آئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں؟ کن لوگوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اور کن لوگوں کو نہیں دی جا سکتی ہے؟ مصارف زکوٰۃ کو لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا

اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ جب رقم جمع کرنے والوں کی صرف نیت ومطالبہ کے باوجود آئے دن یہ معاملہ سامنے آتی رہتی ہے تو وہ ادارے کی رقم جس کا کوئی مالک متعین نہیں، اس کا کیا حشر ہوگا؟۔

یہ بات مقصد زکوٰۃ کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ زکوٰۃ کا مقصد ان ضروریات کو پورا کرنا ہے، جس سے لوگ اس وقت دوچار ہیں، اگر آپ اس رقم کو مستقبل کے لئے محفوظ کر دیں تو ان کی فوری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اس لئے نہ سرمایہ کاری زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے کافی ہے اور نہ اس سے زکوٰۃ کے مقصد وضمانی کی تکمیل ہوتی ہے، بلکہ اس سے مستحقین زکوٰۃ کا استحصال اور ان کی حق تلفی ہے — آج کل بعض گوشوں سے یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں فکس ڈپازٹ کر دیا جائے اور اس کا انٹرسٹ مستحقین کو دیا جائے، یہ تو زکوٰۃ جیسی عبادت کو سود کی نجاست میں آلودہ کرنا اور خود گناہ گار ہونا اور دوسروں کو گناہ گار بنانا ہے، اولاً تو زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں محفوظ کرنے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی، پھر اس رقم کو سود کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنانا زکوٰۃ جیسی عبادت کی کھلی ہوئی اہانت ہے، اور اس رقم کو فقراء میں تقسیم کرنا لوگوں کو سود کھلانا اور سود خواری کا مرتکب بنانا ہے، ایسے ناشائستہ اور ناروا عمل کی کیوں کر گنجائش ہو سکتی ہے؟ اس لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقین کے ہاتھ تک پہنچے بغیر فکس ڈپازٹ کر دی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

زکوٰۃ کا مصرف فقراء ومساکین ہیں، اس لئے ایسی چیزیں جو رفاہی مقاصد کے لئے ہیں، اور تمام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں، ان میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی، چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، وَاتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّهٗ لَا یَجُوْزُ اَنْ یُّخْرِجَ الزَّکٰوۃَ اِلٰی بِنَاءِ مَسْجِدٍ (الافصاح ۱/۲۲۲)۔ اسی طرح پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستگی، نہروں کے چشموں کی مرمت، پانی پینے کے لئے سبیلوں کی تعمیر وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، (المغنی مع شرح الکبیر ۲/۵۲۷، بدائع الصنائع ۲/۳۹)۔ اسی لئے ہسپتالوں یا لائبریریوں کی تعمیر اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ

میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، ہاں علاج کے لئے فقیر کو زکوٰۃ کی رقم سے دوا خرید کر یا نقد رقم دی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ کا مقصد خالصتاً لوجہ اللہ کسی عوض اور بدل کے بغیر مستحقین کی اعانت ہے۔ لہٰذا کسی بھی ایسے کام میں زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی جس میں زکوٰۃ کی حیثیت عوض و اجرت کی ہو جائے، جیسے مساجد میں امام و مؤذن کی تنخواہ کے لئے، مدارس اور اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے، مساجد کے صفائی اور مسالی ملازمین کے لئے، اگر ان کو بطور تنخواہ یا اجرت کے زکوٰۃ کی رقم میں سے دیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے جن مدارس میں غریب طلبہ کے لئے مفت قیام و طعام کا نظم نہ ہو ان کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے۔

آج کل ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہو گیا ہے کہ خوش حال ماں باپ اپنے بچوں کی میڈیکل، انجینئرنگ تعلیم اور ڈونیشن کے لئے لاکھوں روپے زکوٰۃ کی رقم وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی مناسب نہیں ہے، اور زکوٰۃ کا جو اصل مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجت اس سے پوری ہو، اس کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے ایک شخص کو ایک مقدار نصاب سے زیادہ زکوٰۃ دینے سے منع کیا ہے، ایک مقدار نصاب تقریباً ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کم و بیش پانچ ہزار روپے ہوتی ہے، ایک لاکھ روپے میں بیس اشخاص کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں، لیکن اب اس رقم سے صرف ایک شخص کو خوب سے خوب تر مستقبل کی تعمیر میں مدد مل سکے گی۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دینی مدارس اور ان اعلیٰ فنی تعلیمات کی نوعیت میں فرق ہے، دینی مدارس میں ایک طالب علم کی سال بھر کی تعلیم اور ضروریات پر صرف دس، دو ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، پھر جو لوگ یہ پڑھ کر نکلتے ہیں، وہ امت کے دین و ایمان کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں، گویا وہ امت کا سرمایہ اور اس کا مفاد ہیں، اور جو طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنتا ہے وہ اپنے مستقبل کی فکر لے کر اٹھتا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کسب زر کی مشین بنتا ہے، دینی مدارس میں بہت بڑی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے کہ وہ اور ان کے والدین اپنے معاشی پس منظر کے اعتبار سے زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور جو طلباء انجینئرنگ یا میڈیکل

میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں وہ کھاتے پیتے گھرانے کے ہوتے ہیں، پھر ان عصری علوم سے بچوں کے مستقبل کی خوش حالی متعلق ہوتی ہے، اس لئے ان شعبوں میں آنے کے لئے ترغیب دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ مادیت کی چمک دمک خود ہی شخص کی نگاہ کو خیرہ کئے رہتی ہے، برخلاف دینی تعلیم کے، کہ اس سے معاد متعلق ہے نہ کہ معاش، خوف آخرت کی کمی اور بڑھتی ہوئی دنیا طلبی کی وجہ سے اس کی طرف لوگوں کا میلان کم ہوتا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کر کے انہیں دینی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مصارف زکوٰۃ بھی اہمیت کے اعتبار سے درجات میں اور اس لحاظ سے دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ اپنے قرابت دار اور اعزہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں، ماں باپ دادا، دادی، نانا، نانی اوپر تک اور ان کا سلسلہ اولاد، شوہر اور بیوی کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی، باقی دوسرے اقرباء بھائی بہن، پھوپھی، خالہ، خسر، خوشدامن، چچا، ماموں وغیرہ کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، ان کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا اجر ہے، زکوٰۃ بھی ادا ہوگی اور قرابت داری کا حق بھی، خاندان میں جو بیوہ، مطلقہ عورتیں، شوہر کی بے توجہی کی وجہ سے بے سہارا خواتین، یتیم لڑکے اور لڑکیاں وغیرہ ہوں، ان پر پہلے توجہ دینی چاہئے، زکوٰۃ دیتے وقت اس کا اظہار بھی ضروری نہیں کہ زکوٰۃ کی رقم ہے، جیسے تحفہ، عیدی اور قرض وغیرہ کے نام سے بھی زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے، صرف اتنا اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر زکوٰۃ کے دو مقاصد ہیں، فقراء کی ضرورت پوری کرنا اور اللہ کے دین کی سربلندی، چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف (جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے) میں سے چھ میں حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنا ملحوظ ہے، اور فی سبیل اللہ اور مؤلفۃ القلوب، ان دو مدات میں دین کی حفاظت و سربلندی اور اس کی اشاعت مقصود ہے، اس وقت دینی مدارس ان دونوں مقاصد کو پورا کرتے ہیں، ایک طرف ان مدارس میں جو طلبہ زیر تعلیم ہیں وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور بہت سے طلباء اپنے دیہاتوں

سرمایہ کار کمپنیوں کا تلخ تجربہ

اسباب وعوامل

گذشتہ ایک دہے میں متعدد مالیاتی تجارتی کمپنیاں ہیں جنہوں نے سنہرے خوابوں کی بہشت سجا کر لوگوں سے ان کی گاڑھی کمائیاں وصول کیں، اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بڑھانے کی غرض سے ابتداءً خوب خوب نفع دیا، لیکن اچانک ایسی صورت حال پیش آئی کہ ان کا خواب ایک "سراب" ثابت ہوا، اور یوں محسوس ہوا کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا"۔ خواہ اس کا سبب ان اداروں کی اقتصادی ناتجربہ کاری ہو یا دیانت وصداقت کی کمی، لیکن ان واقعات نے کتنے ہی دلوں کو رلایا اور تڑپایا ہے۔ ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جنہوں نے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی پوری زندگی کا حاصل لگا دیا تھا، تاکہ بڑھاپے کی بے بسی اور بے کسی میں یہ سہارا بن سکے، بہت سی بیوائیں تھیں جنہوں نے اسے اپنے یتیم بچوں اور بچیوں کی کفالت کا ذریعہ تصور کر کے ساری پونجی اس میں ڈال دی تھیں، کتنے ہی ضرورت مند اور محتاج تھے کہ شب و روز محنت کر کے انہوں نے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اسے حفاظت اور نفع کی امید پر ان اداروں کے سپرد کیا تھا۔ اب امیدوں اور آرزوؤں کے خوبصورت تاج محل زمین بوس ہیں اور بہت سی حسرتوں کا مدفن بنے ہوئے ہیں۔

یہ تو ان واقعات کا اقتصادی اور سماجی پہلو ہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں غیر سودی اور حلال بنیاد پر سرمایہ کاری سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، اور دینی، سرکاری اور نجی اداروں پر

لوگوں کا اعتماد واعتبار بڑھ رہا ہے جو سود پر یقین رکھتے ہیں، اور علانیہ سود کا لین دین
کرتے ہیں، یہودی نظام معیشت اور اس کے زیر اثر مغرب کا معاشی نظام تو کہتا ہی
ہے کہ غیر سودی سرمایہ کاری نا قابل عمل اور غیر محفوظ صورت ہے، ساتھ ہی ساتھ خود
مسلمانوں کے ہاتھ قائم ہونے والے یہ ادارے بھی بالواسطہ ان کے دعویٰ کو تقویت
پہنچاتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے جو معاشی نقصان پہنچتا ہے اس کا اثر تو ممکن ہے کہ
چند سالوں میں ختم ہو جائے؛ اس لئے کہ زخم کتنا بھی گہرا ہو ایک نہ ایک دن مندمل ہو
کر رہتا ہے، اور دل پر کیسی بھی چوٹ لگے آج نہ کل آنسو تھم ہی جاتے ہیں، لیکن
اسلام کے غیر سودی سرمایہ کاری کے تصور پر ان واقعات کی وجہ سے جو چوٹ لگی ہے
اور اسلامی نظام معیشت سے سماج کا یقین جس طرح مجروح ہوتا ہے، شاید پچاس
سال میں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو؛ اس لئے ایسے تکلیف دہ واقعات گہرے غور وفکر
کے متقاضی ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں جو برائیاں بہت ہی سنگین ہیں، ان میں سے ایک سود بھی ہے،
سود کی شناعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے والے
پر لعنت فرمائی بلکہ سود دینے والوں، سودی معاملات کے لکھنے والوں، اور ایسے معاملہ پر
گواہ بننے والوں پر بھی آپ ﷺ نے لعنت کی ہے (مسلم عن جابر بن عبد اللہ) حضرت
ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ بات
لازم کرلی ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہیں فرمائیں گے اور ان کو جنت کی
نعمتوں کا مزہ تک چکھنے سے محروم رکھیں گے۔ ایک شراب کا خوگر، دوسرے سود خوار،
تیسرے ناحق یتیم کا مال کھانے والا، اور چوتھے والدین کا نافرمان (حاکم عن ابی ہریرہ) ——
لیکن ظاہر ہے کہ کسی برائی سے روکنا اس وقت تک مفید اور مؤثر نہیں ہوتا جب تک کہ
اس کے لئے جائز وحلال متبادل پیش نہ کیا جائے۔ اسلام نے سودی لین دین کا راستہ
بند کرنے کے لئے بنیادی طور پر دو طریقے اختیار کئے۔ ایک تو قرض کے لین دین کو
آسان فرمایا، لوگوں کو اس کی ترغیب دی؛ تاکہ لوگ سود دینے پر مجبور نہ ہوں۔ جب

معاشرہ میں سود دینے والے لوگ نہ رہیں گے، تو اس سے سود خواروں کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور سودی کاروبار پروان نہیں چڑھ سکے گا، دوسری طرف ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے کاروبار کو جائز قرار دیا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ شرکت سے ایسے کاروبار مراد ہے جس میں مختلف لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، محنت چاہے تمام سرمایہ کاروں کی ہو یا بعض کی ہو، لیکن نفع میں حسب معاہدہ سب شریک ہوں، مضاربت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا مال ہو اور کچھ لوگوں کی محنت، اور نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں، کاروبار کی یہ دونوں صورتیں جائز نفع کا راستہ کھولتی ہیں، اور سودی نظام کو بند کرنے میں معاون ہیں۔

اصل یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن سرمایہ کو کس طرح نفع آور بنایا جائے؟ یا تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، یا واقف ہونے کے باوجود کام کرنے کی قوت نہیں رکھتے یا وقت نہیں پاتے، اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا سرمایہ لگا رہے۔ اور بیٹھے بٹھائے ان کا نفع آتا رہے۔ یہی خواہش سودی کاروبار کرنے والوں کے لئے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے، اسلام نے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے ذریعہ اپنے سرمایہ سے نفع اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، شرکت ہی کی طرح مضاربت میں بھی نفع کا تناسب متعین ہونا چاہئے، نہ کہ نفع کی مقدار، اگر نفع کی مقدار متعین ہو جیسے دس ہزار پر پانچ سو روپے، تو یہ سود میں شامل ہے اور حرام ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ کار اور عامل کے نفع کی شرح میں یکسانیت ہو، اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، مثلاً ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد یا ستر فیصد اور تیس فیصد کی شرح سے نفع متعین ہو، یہ درست ہے۔

بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی یہ دو صورتیں ہیں، جو زیادہ نفع آور بھی ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس میں نقصان کا خطرہ بھی زیادہ ہے، کیونکہ ایک تو کاروبار میں نشیب و فراز ہوتا ہی ہے، دوسرے آج کل دیانت و امانت کی بھی کمی ہے، اور شرکت و مضاربت کا زیادہ تر انحصار دیانت اور ایمانداری پر ہے، اس لئے اسلامی خطوط پر

دائرہ میں ہو نیز ان کے کاروبار کی عوامی نگرانی ہو سکے گی، اور دوسری طرف سرمایہ کاروں کی دولت کی ضمانت محفوظ ہو اور نفع آور ہو سکے گی۔ کسی عملی تدبیر کے بغیر محض اخبارات پر وقتی بیانات دے دینا، اور سرمایہ کاروں سے لفظی ہمدردی کا اظہار کر دینا مسئلہ کا موثر اور مستقل حل نہیں، کاش ہمارے قائدین، علماء اور اہلِ دانش اس جانب کوئی توجہ کریں۔

(۱۲/۱/۱۹۹۹ء)

اسلام میں سرمایہ کاری کے اصول اور موجودہ حالات کا تقاضا

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسانوں اور صلاحیتوں کی ایسی تقسیم فرمائی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں نامکمل اور دوسرے کا محتاج ہے، اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی اپنی منزل تک پہونچ سکتا ہے، کسی کے پاس دولت ہے، لیکن وہ جسمانی قوت سے محروم ہے، کوئی شخص صحت مند اور محنت کرنے کے لائق بھی ہے، لیکن علم و آگہی سے تہی دامن ہے، جیسے اندھا اور لنگڑا ایک دوسرے کی مدد کر کے اپنا سفر طے کر سکتے ہیں، اسی طرح یہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی مطلوبہ منزل کو پا سکتے ہیں۔

معاشی نظام میں بھی یہی طریقۂ کار کسی قوم اور سماج کی ترقی کا راز ہے، کچھ لوگوں کے پاس سرمایہ ہے، لیکن خود کاروبار اور تجارت کی قوت یا اس کا تجربہ نہیں، کچھ لوگ کاروبار کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں، اگر سرمایہ کاروں کا مجمع سرمایہ اور اس دوسرے گروہ کی محنت کا اشتراک ہو تو اس سے دونوں طبقوں کو نفع ہوگا، اور بحیثیت مجموعی قوم اور ملک کو بھی اس کا نفع پہونچے گا، اسی لئے اسلام نے ایسے اشتراک کی نہ صرف گنجائش رکھی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اسلام نے بنیادی طور پر اس کے لئے دو طریقے رکھے ہیں: شرکت اور مضاربت۔ شرکت کے معنی ساجھے دار ہونے کے ہیں، یعنی ایسا کاروبار جس کو متعدد لوگ مل کر کریں، جو شخص کسی چیز میں کچھ حصہ کا مالک ہو عربی زبان میں وہ ''شریک'' کہلاتا ہے، فقہ کی اصطلاح میں شرکت ایسے کاروبار کو کہتے ہیں، جس میں ایک سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ شریک ہو اور نفع میں بھی وہ سب شریک ہوں: ''عقد بین المتشارکین فی راس

تو اگر ایک یونٹ میں نقصان بھی ہو تو دوسری یونٹوں کے نفع سے اس کی بھرپائی ہو سکتی ہے۔

اب محسوس ہوتا ہے کہ ماضی قریب میں جو کمپنیاں قائم ہوئیں، انہوں نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا۔ کسی نے پوری رقم چمڑے میں صرف کردی۔ کسی نے بلڈنگوں کی تعمیر میں، کسی نے اسکراپ کی خرید و فروخت میں، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کاروبار میں انحطاط ہوا تو پورا کاروبار ہی بیٹھ گیا، جو لوگ سرمایہ کاروں کو شرکت کی دعوت دیں ان کو چاہئے کہ وہ پہلے سرمایہ کاری کے فائدہ بخش مواقع کو ماہرین کی مدد سے خوب اچھی طرح سمجھ لیں، پھر قدم اٹھائیں۔

جو لوگ اپنا سرمایہ مشغول کریں، ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ سنہرے خواب دکھانے والوں کی طرف آنکھ بند کرکے نہ دوڑیں، بلکہ پہلے خوب اچھی طرح تحقیق کریں کہ کمپنی سرمایہ کہیں مشغول بھی کررہی ہے یا نہیں؟ اگر مشغول کررہی ہے تو کیا اس کاروبار سے وہ نفع حاصل ہو سکتا ہے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین سے دریافت کریں، پھر خوب سوچ سمجھ کر سرمایہ لگائیں، یہ کہنا کہ آج ہم دس ہزار روپے لگائیں اور کل ہی سے اس پر نفع حاصل کریں، بلکہ پہلے مہینے کا نفع رقم دیتے ہوئے ہی وضع کرلیں، ناقابل فہم باتیں ہیں، دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جو شروع ہونے سے پہلے ہی یا شروع ہوتے ہی نفع دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نفع و نقصان کو ظاہری اسباب سے متعلق رکھا ہے، ان اسباب کو نظر انداز کرکے کام کرنا توکل نہیں، بے وقوفی اور بے عملی ہے، اور اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا اور حسرت و افسوس سے دوچار ہونا نوشتۂ دیوار!!

(۱۹/ مارچ ۱۹۹۹ء)

ہے۔ اس سے تعاون ملتا ہے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ بے روزگاری اور غربت کی صورت حال کا علاج تو نہیں ہے کی۔ جب ایک "ایسٹ انڈیا کمپنی" پورے ملک کو اپنا غلام بنا سکتی ہے تو آج ساری کمپنیاں کیا کچھ نہیں کر سکتی ہیں؟ — حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اہم ہیں۔ تجارت میں مسابقت ضروری ہے۔ اس سے قیمتوں میں توازن قائم رہتا ہے اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے ان کا ذریعۂ معاش ہی چھن نہ جائے۔ ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تجارت کا تمام تر طلب و رسد کے اصول پر قائم ہے۔ اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے، لیکن اس کی تیاری اور فراہمی طلب کے مطابق نہ ہو پائے تو قیمتیں بڑھیں گی، اور اگر رسد طلب کے برابر ہو تو قیمت میں توازن رہے گا، اور طلب کے مقابلہ اشیاء کی فراہمی اور تیاری زیادہ ہو تو قیمتیں گر جائیں گی۔ تاجروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی فطرت پر قائم رہنے نہیں دیتے، بلکہ بازار میں مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں، تاکہ قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھ جائیں، تجارت نے ہمیشہ اس حربہ کو اختیار کیا ہے، اور غریب عوام کی زندگی کو اپنے لوٹنے کے لئے ایک جال بنا رکھا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں ایسے طریقے مروج تھے، مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی تجارتی قافلہ باہر سے آتا تو شہر کے سرمایہ کار تاجر پہلے نکل کر ان سے مال سستے داموں خرید لیتے، اور انہیں باور کراتے کہ شہر کے بازار میں یہ سامان اسی قیمت میں فروخت ہو رہا ہے، اس سے دو نقصان ہوتا، ایک تو جو لوگ زراعت کے ذریعہ پیداوار حاصل کرتے، یا محنت کر کے مال تیار کرتے، انہیں بازار کے عام نرخ کے مقابلہ کم قیمت ملتی اور اپنی محنت کا کماحقہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، دوسری طرف کھلے بازار میں مال آنے سے پہلے اس کے خرید لینے کی وجہ سے مارکیٹ میں اس سامان کی مصنوعی قلت پیدا ہو جاتی، اور جب لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اشیاء کم پڑتیں تو قیمتیں بڑھ جاتیں، اور عوام نقصان اٹھاتے، گویا چند سرمایہ دار تاجروں کی وجہ سے پیدائش کار اور

عوام دونوں کو نقصان ہوتا۔ اس طریقہ کو "تلقی رکبان" کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

اسی طرح ایک طریقہ یہ تھا کہ دیہات کے لوگ جب اپنی پیداوار شہر میں لے کر آتے تو دیہات کی قیمتوں کے معیار اور شہر کے حالات سے ناواقفی کی وجہ سے کم قیمت میں اپنا مال فروخت کر دیتے، شہر کے جو چالاک تاجر ہوتے، وہ اسے ترغیب دیتے کہ اپنا مال ان کے حوالے کر دیں، وہ اس کو ان کے لئے گراں قیمت میں فروخت کر دیں گے۔ اس طرح دیہات سے سامان آنے کی وجہ سے شہر میں جو ارزانی ہو سکتی تھی وہ پیدا نہیں ہو پاتی، اس کو "بیع حاضر للبادی" کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کو بھی منع فرمایا۔

سامان کے نرخ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا ایک بڑا طریقہ ذخیرہ اندوزی کا ہے، یعنی اشیاء ضروریہ کو روک کر رکھنا تاکہ بازار میں اس کی قلت پیدا ہو جائے اور اس طرح ان چیزوں کا نرخ اونچا ہو جائے، یہ طریقہ آج بھی مروج ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھی فرمائی ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو احتکار کا مرتکب پایا تو اسے منع کیا اور کہا کہ حضور ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں جذام کا خیال ظاہر فرمایا ہے، راوی کا بیان ہے کہ واقعی وہ شخص جذام میں مبتلا ہوا (ابن ماجہ: باب الحکرۃ والجلب، مسند احمد ۱/۲۱) احتکار کی ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ اس سے قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھتی ہیں اور عام لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے "نجش" سے منع فرمایا، نجش سے مراد یہ ہے کہ کسی سامان کی ڈاک لگائی جائے، اور ایک شخص کا سامان لینے کا ارادہ نہ ہو، لیکن وہ محض قیمت چڑھانے کے لئے بڑھ کر بولی لگائے، تاکہ دوسرے خواہش مند حضرات خواہ مخواہ قیمت بڑھا دیں اور اس طرح مناسب قیمت سے زیادہ میں مال فروخت ہو، رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اشیاء کی قیمتوں کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے، نہ مصنوعی طور پر قیمت بڑھائی جائے، اور نہ قیمت گرائی جائے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص خدمت

اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اشیاء کی قیمتیں متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے کہا: رہنے دو، پھر ایک دوسرے صاحب نے یہی بات کہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی قیمت گھٹاتے اور بڑھاتے ہیں، میں اس حال میں اللہ سے ملنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر کسی کا دعویٰ ظلم نہ ہو۔ (ابو داؤد، حدیث نمبر ۳۴۵۰) حضرت انسؓ سے بھی ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، آپ ﷺ ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیمت مقرر کرنے والا اللہ ہے، وہی تنگی اور کشادگی پیدا کرتا ہے اور وہی رزاق ہے۔ (ابو داؤد، حدیث نمبر ۳۴۵۱)

غرض منشاء نبوی یہ ہے کہ مارکیٹ کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے، کبھی طلب کے اعتبار سے رسد بڑھ گئی، اور عوام کو فائدہ ہوگیا، اور کبھی رسد کے اعتبار سے طلب زیادہ ہوگئی اور تاجروں کو معمول سے زیادہ فائدہ ہوگیا، چنانچہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ ہی بعض کو بعض سے رزق فراہم کرتے ہیں: "دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض" (مسلم، حدیث نمبر ۱۵۲۲) — تاہم اگر گراں فروشی حد برداشت سے بڑھ جائے، اور تجار اخلاق کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں، تو حکومت کو حق ہے کہ وہ قانون کی لاٹھی استعمال کر کے اس مسئلہ کو حل کرے، اسی لئے فقہاء نے اجازت دی ہے کہ خصوصی حالات میں ذخیرہ اندوزی کے سد باب کے لئے ذخیرہ اندوزوں کا مال زبردستی فروخت کیا جا سکتا ہے، اور اشیاء ضروریہ کا نرخ متعین کر کے تجار کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی قیمت پر سامان کو فروخت کریں۔

یہ اسوۂ نبوی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا اصل مزاج یہی ہے کہ تمام لوگوں کو اپنا مال مارکیٹ میں لانے کی آزادی حاصل رہے، اور وہ بے روک ٹوک خرید و فروخت کر سکیں، تاکہ مسابقت برقرار رہے، اس سے لوگوں کو سستی اور معیاری اشیاء حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی طبقہ کو ضرر سے بچانا اور ان کے ساتھ ناانصافی کا سد باب کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل کا عمومی حکم دیا

ہے: "ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان" (النحل: ۹۰) ملکی صنعتوں کی تباہی اور کاشتکاروں کی مایوسی میں نہ صرف ان لوگوں کا نقصان ہے، بلکہ مجموعی اعتبار سے اس کی مضرت کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے، کیوں کہ جب بے روزگاری بڑھے گی تو لوگوں کی بنیادی ضروریات کا پورا ہونا بھی مشکل ہو جائے گا، ملک میں لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا رجحان بڑھے گا، اور جب بیرونی کمپنیاں تجارت کے کسی شعبہ پر حاوی ہو جائیں گی، اور اندرون ملک صنعتوں پر غلبہ حاصل کر لیں گی، تو پھر ان کا استحصال سے باز رہنا دشوار ہوگا، اور اندیشہ ہے کہ وہ اپنی من مانی قیمت لگا کر لوگوں کو اسی قیمت میں خرید و فروخت کرنے پر مجبور کر کے رکھ دیں گی، پھر تو یہ ارزانی بھی بے ثبات ثابت ہوگی اور گرانی پر کنٹرول مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی کمپنی کو ملک کے بازار میں بلا تحدید داخل ہونے کی اجازت دی جائے، تو اس سے ایسے معاہدے کئے جائیں کہ بتدریج وہ اپنی ٹکنالوجی بھی فراہم کرے، اور ملک میں اپنی صنعتیں قائم کرے، ان صنعتوں میں مقامی ہنرمندوں اور مزدوروں کو کام کے مواقع دیے جائیں، اس طرح بے روزگاری کا سیلاب تھم سکے گا، اور عام لوگوں کے لئے اس کے فوائد دیرپا ہوں گے، قدیم زمانہ میں صنعت و حرفت میں وسائل اور ٹکنالوجی کا اتنا فرق نہیں ہوتا تھا کہ قیمتوں پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑے، البتہ مزدور اور نقل و حمل کی اجرت کے فرق کی وجہ سے اشیاء کی پیداوار مہنگی یا سستی ہوا کرتی تھی، اس تفاوت کو دور کرنے، قیمتوں میں توازن رکھنے اور ملکی پیداوار کو بچانے کی غرض سے ایک خاص طریقہ تجارتی ٹیکس کا مروج تھا، چنانچہ فقہاء نے غیر ملکی تاجروں سے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے بدلے انہیں تجارت کے مواقع بھی دیے جاتے تھے، اور ان کی حفاظت و نگہداشت کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی تھی، اب ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ اور پسماندہ ہونے کا بھی قیمت پر نمایاں اثر پڑتا ہے، اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، مارکیٹ کو کھلی اور

ہو، وقتی تاجروں کے لئے نفع اندوزی کا ذریعہ ہو اور سرمایہ داروں کو عوام کا استحصال کرنے کا موقع نہ ملے، اور ایسے قوانین و تحدیدات بھی ضروری ہیں، جن کے ذریعہ جدید ٹیکنالوجی سے محروم ملکی صنعت کاروں، دستکاروں کے مفادات کو بھی تحفظ ہو، اور ان کے حقوق بھی پامال نہ ہونے پائیں، کہ یہی تقاضۂ عدل ہے، اور اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسانوں کے بیچ عدل پر قائم رہے، کہ یہی تقویٰ سے قریب ترین راہ ہے، "اعدلوا ھو اقرب للتقوی" (المائدۃ: ۸)۔

(۱۳؍اپریل ۲۰۰۱ء)

اسی لئے قرآن نے انسانی نطفہ کو بھی ’’ماءِ دافق‘‘ یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ (طارق ۶) اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جانداروں کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے ’’وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ‘‘ (نور ۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں ’’وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ‘‘ (لقمان ۱۰) جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا کوہ و زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے، اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے، ’’وَاللّٰہُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا‘‘ (نحل ۶۵)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کر لیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہو جاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں نمک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو کھولاتی ہے، اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اٹھتا ہے، اور ہوائیں اسے گود میں لے کر ان کشادہ فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں، وہ ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے، اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضا کی سیر کرتا رہتا ہے، اور جہاں چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا انتظامِ قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چونکہ اپنے بقا کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سرسبز و شاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی

ہے، کسانوں کا پیٹ پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بارش کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے، قانونِ الٰہی کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں، چونکہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں وہیں پرندوں اور جنگلی درندوں والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے، لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے، اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب بھی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم و بیش یکساں رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضا میں جھومتے اپنے گھروندے بناتے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دستِ سوال پھیلائے رہتے ہیں، لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ، اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ دراصل مشیتِ خداوندی کا کرشمہ ہے کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دوچار ہے، اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو شدتِ اس بحران کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں نصاب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحبِ نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے، حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم و جور ہو جاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہلِ مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے

ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے، بوڑھوں کو تہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے، برسر عام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے، ''اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (البقرۃ: ۱۵۳) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ ﷺ نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نماز شکر، کسی مسلمان کی موت ہوجائے تو استغفار کے لئے نماز جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو نماز توبہ، کسی معاملہ میں خیر و شر اور نفع و نقصان سمجھ میں نہ آتا ہو تو نماز استخارہ، سورج گہن ہو تو نماز کسوف، چاند گہن ہو تو نماز خسوف، کوئی ضرورت درپیش ہو تو نماز حاجت، اسی طرح اگر بارش رک جائے تو نماز استسقاء۔

رسول اللہ ﷺ نے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے، اور صرف دعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ ﷺ خطبہ جمعہ ارشاد فرمارہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، انھوں نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہورہے ہیں، اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعا مانگئے، آپ ﷺ نے تین بار دعا کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایت میں ''اللّٰھم اسقنا'' کے الفاظ ہیں، اور بعض میں ''اغثنا'' کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا، لیکن آپ ﷺ کی دعاء اسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا، اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں اور جانور غرقاب ہورہے ہیں، آپ دعا فرمائیے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعا فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، ''اللّٰھم حوالینا ولا

علینا"۔ چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گرد و پیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا۔ (بخاری، حدیث نمبر ۱۰۳۳) حضور ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر بارش کے لئے دعا فرمائی تھی، اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، حالانکہ خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دست مبارک اتنا اونچا اٹھایا کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی۔ (بخاری، حدیث نمبر ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱) حضور ﷺ کے اسی عمل کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دعا پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ (رد المحتار ۳/۷۰)

بہتر یہ ہے کہ دعا کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز بھی اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ "سبح اسم ربك الاعلى" اور "هل اتك حديث الغاشية" کی سورت پڑھی جائے۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۱۴۱۵)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہو کر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے، اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں۔ (رد المحتار، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۱۴۲۰) کیونکہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز عید کی طرح نماز استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں، اور جیسے خطبہ عیدین میں کلمات تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے، کیونکہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۱۴۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطبات عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی طرح استسقاء کے خطبہ اولیٰ میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالہ سابق ۲/۱۴۲۱)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گزر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردے، اور اگر گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کردے، لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبد اللہ بن زید ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ردا مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں، بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو، اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی جائے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۱۴۰۳) یہ بھی مستحب ہے کہ نماز استسقاء کے موقع سے بوڑھوں، اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے، بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (ردالمحتار: ۳/۷۵) کہ ان کمزوروں کو دیکھ، اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہو تو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نماز استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں، اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں تو حق ادا کردینے کی کوشش کریں۔ (ردالمحتار: ۳/۷۰) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، لیکن امام ابو داؤد نے حضرت عائشہ ؓ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج نکلتے وقت نماز استسقاء کے لئے تشریف لے گئے۔ (ابوداؤد، باب رفع الیدین فی الاستسقاء) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت نماز استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں علاقہ کے دیندار لوگوں کو شامل رکھا جائے، حضرت عمر ؓ نے خاص طور پر حضرت عباس ؓ کو اور

قنوتِ نازلہ —— احکام و مسائل

اللہ قادر مطلق ہے۔ اور انسان اپنے خالق کے مقابلہ عاجز محض، دنیا میں کوئی بھی واقعہ جو پیش آتا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر وہ وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک صاحب ایمان کا کام یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی مصیبت یا آزمائش سے دوچار ہو، اللہ کی طرف رجوع کرے، اور اللہ کے خزانۂ غیب سے مدد کا طلب گار ہو؛ اسی لئے اسلام میں ایک مستقل نماز "نماز حاجت" رکھی گئی، کہ انسان کی کوئی بھی ضرورت ہو، دو رکعت نماز خاص اسی نیت سے پڑھ کر اللہ کے سامنے دست سوال پھیلائے، بعض دفعہ ضرورتیں یا ابتلائیں غیر معمولی ہو جاتی ہیں، ان مواقع کے لئے شریعت نے مخصوص نمازیں رکھی ہیں، جیسے کسی کی وفات ہو جائے تو نماز جنازہ، بارش نہ ہو تو نماز استسقاء، کسی معاملہ کے بارے میں اضطراب ہو کہ کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے؟ تو نماز استخارہ، سفر کے موقع پر دوگانۂ سفر۔

اسی طرح اگر دشمنوں سے مقابلہ ہو، خواہ مسلمان اعداء اسلام کے خلاف اقدامی جہاد کر رہے ہوں، یا مدافعت کے موقف میں ہوں، یا ظلم و ابتلاء سے دوچار ہوں، تو ایسے مواقع کے لئے کوئی مستقل نماز تو نہیں رکھی گئی، لیکن ایک خصوصی دعاء رکھی گئی ہے، جس کو "قنوت نازلہ" کہتے ہیں، نازلہ کے معنی مصیبت و آزمائش کے ہیں، اور قنوت کے متعدد معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک معنی دعاء ہے، اور اس تعبیر میں یہی معنی مراد ہے، یعنی قنوت نازلہ کے معنی ہوئے مصیبت کے وقت کی دعاء، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جو کمزور لوگ چھپے ہوئے تھے، اور اہل مکہ انھیں ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کے لئے قنوت نازلہ پڑھی ہے، اسی طرح ایک خاص واقعہ پیش آیا،

جس میں حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید کردی گئی، یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں بڑی صراحت سے مشہور ہے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھی ہے۔

قنوت نازلہ کے سلسلہ میں کئی باتیں قابل ذکر ہیں، قنوت نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص تھا، یا آج بھی امت کے لئے باقی ہے؟ قنوت نازلہ کن مواقع پر پڑھی جائے گی؟ کس نماز میں پڑھی جائے گی؟ اور نماز میں قنوت پڑھنے کا کیا محل ہے؟ کون پڑھے گا؟ بآواز بلند پڑھی جائے یا آہستہ؟ جب امام قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ قنوت نازلہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے کن الفاظ میں منقول ہے؟

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ قنوت نازلہ آپ ﷺ کے لئے مخصوص تھی، لیکن تمام قابل ذکر فقہاء و ائمہ مجتہدین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی قنوت نازلہ کا حکم باقی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر ؓ سے مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے وقت آپ نے قنوت نازلہ پڑھی، حضرت عمر ؓ نے بھی بعض مواقع پر قنوت نازلہ پڑھی ہے، آپ کی قنوت کے الفاظ بھی کتب احادیث میں تفصیل کے ساتھ منقول ہیں، خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کے درمیان جنگ کے موقع پر دونوں نے قنوت نازلہ پڑھا ہے۔ (دیکھئے: منحة الخالق علی البحر: ۲/۴۴) ن نے صحیح لکھی ہے کہ قنوت نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص نہیں تھا، اور اب بھی یہ حکم باقی ہے، ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ (دیکھئے: محلی: ۴/۲۲۰، شرح مہذب: ۳/۵۰۴، المغنی: ۲/۱۳۵)

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و جدال کے علاوہ دوسری مصیبتوں کے موقع پر بھی قنوت نازلہ پڑھنی مسنون ہے، امام نووی شافعی نے وباء اور قحط میں قنوت پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ (روضة الطالبین مع المنتخب: ۱/۲۵۴) حنابلہ کے یہاں بھی ایک قول یہ ہے کہ وبائی امراض پھوٹ پڑنے پر بھی قنوت نازلہ پڑھی جا سکتی ہے۔ (دیکھئے: الانصاف مع المقنع: ۳/۲) حنفیہ نے بھی لکھا ہے کہ طاعون کی بیماری پھیل جائے تو اس کا شمار بھی نوازل میں ہوگا۔ (ردالمحتار: ۲/۲۴۴) ویسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے وبائی امراض وغیرہ میں قنوت نازلہ پڑھنا ثابت نہیں، چنانچہ حضرت عمر ؓ

کے عہد میں جو طاعون عمواس کا واقعہ پیش آیا، تو اس موقع پر قنوت نہیں پڑھی گئی (الانصاف: ۲/ ۱۰۳) گویا اصل میں تو قنوت نازلہ جنگ کے موقع پر پڑھی گئی ہے، لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء نے دوسری مصیبتوں میں بھی قنوت نازلہ کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح میں قنوت اسی وقت پڑھتے تھے، جب کسی گروہ کے حق میں دعا کرنا یا کسی گروہ کے خلاف بددعا کرنا مقصود ہوتا۔ (اعلاء السنن، حدیث نمبر ۱۵۷۵) اسی مضمون کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (اعلاء السنن: حدیث نمبر ۱۵۱۴)

گویا جب مسلمان اعداء اسلام سے جنگ کی حالت میں ہوں تب تو خاص طور پر قنوت نازلہ مسنون ہے، لیکن دوسری اجتماعی مصیبتوں کے موقع پر بھی قنوت نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

قنوت نازلہ کس نماز میں پڑھنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مسلسل ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قنوت نازلہ پڑھی ہے، جس میں آپ نے بنو سلیم، رعل، ذکوان، عصیہ قبائل کے لئے بددعا فرمائی ہے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۴۴۳) بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مغرب اور فجر میں قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۴) رسول اللہ ﷺ کا فجر اور مغرب میں قنوت نازلہ پڑھنا حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (طحاوی: ۱/ ۱۴۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں نماز عشاء میں قنوت نازلہ پڑھنے اور مکہ کے مستضعفین کے لئے دعا کرنے کا ذکر ہے، امام طحاوی نے اس کو متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ — چنانچہ فقہاء شوافع کے نزدیک تو پانچوں نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ (شرح مہذب: ۳/ ۵۰۲، روضۃ الطالبین: ۱/ ۲۵۴) حضرت امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے، ایک قول کے مطابق فجر اور مغرب میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہئے، ایک قول

یہ ہے کہ تمام جہری نمازوں میں پڑھ سکتا ہے، اور ایک قول کے مطابق صرف نماز فجر میں۔ (دیکھئے الشرح الکبیر ۲/۳۶۷، الانصاف مع المقنع ۲/۱۷۶) غرض حنابلہ کے مختلف اقوال اس سلسلہ میں منقول ہیں۔

فقہاء احناف کے یہاں دو طرح کی تعبیرات ملتی ہیں، ایک یہ کہ تمام جہری نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھنا چاہئے، فقہ حنفی کی آخر متون یعنی بنیادی کتابوں میں یہی لکھا ہے: ''فیقنت الامام فی الصلوۃ الجھریۃ'' (ملتقی الابحر علی ہامش المجمع: ۱/۱۲۹) مشہور حنفی فقیہ علامہ حصکفی نے بھی بعینہ یہی الفاظ لکھے ہیں۔ (در مختار مع الرد ۲/۴۴۸) مشہور محقق امام طحاوی نے بھی جہری نمازوں میں قنوت کی اجازت نقل کی ہے۔ (طحاوی علی المراقی: ۲۰۶) یہی بات بعض دوسرے فقہاء احناف سے بھی منقول ہے۔ (دیکھئے رد المحتار ۲/۴۴۸) ماضی قریب کے اہل علم میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (فیض الباری ۲/۲۰۲) اور علامہ حموی نے اسی قول کو زیادہ درست قرار دیا ہے۔ (منحۃ الخالق علی البحر: ۲/۳۴) — دوسری رائے یہ ہے کہ صرف نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھنا درست ہے، علامہ شامیؒ کا رجحان اسی طرف ہے، شامیؒ کا گمان ہے کہ ممکن ہے کہ بعض نقل کرنے والوں نے ''صلاۃ الفجر'' کو غلطی سے ''صلاۃ الجہر'' لکھ دیا ہو۔ (دیکھئے رد المحتار ۲/۴۴۸) لیکن جب اتنی ساری نقول موجود ہیں، تو محض ظن وتخمین کی بناء پر اسے رد نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے خود علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ شاید اس سلسلہ میں احناف کے دو قول ہیں۔

''ولعل فی المسئلۃ قولین''۔

(منحۃ الخالق علی ہامش البحر ۲/۳۴)

پس، جو بات راجح معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قنوت نازلہ مغرب، عشاء اور فجر تینوں میں پڑھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں احادیث موجود ہیں، البتہ چونکہ فجر کے بارے میں اتفاق ہے، اور دوسری نمازوں کی بابت اختلاف ہے، اس لئے بہتر ہے کہ فجر میں قنوت نازلہ پڑھنے پر اکتفا کیا جائے۔ رہ گئی حضرت عبد اللہ ابن عباس ؓ کی

روایت جس میں ظہر و عصر میں قنوت نازلہ پڑھنے کا ذکر ہے تو اکثر فقہاء کے نزدیک وہ منسوخ ہے، اور احادیث میں بعض قرائن اس کے منسوخ ہونے پر موجود ہیں۔

نماز میں قنوت نازلہ کب پڑھی جائے گی؟ تو اس سلسلہ میں احادیث قریب قریب متفق ہیں کہ قنوت نازلہ رکوع کے بعد پڑھی جائے۔ (دیکھئے بخاری، حدیث نمبر ۱۰۰۲، ۱۰۰۱، ۱۰۰۳، حدیث نمبر ۱۳۰۰) فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

(منحۃ الخالق علی حاشیۃ البحر ۲/۴۴)

دعاء قنوت زور سے پڑھی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ مضر کے خلاف بددعاء کرتے ہوئے جہراً قنوت پڑھی ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر، باب قولہ لیس لک من الامر شیٔ) اس لئے راجح قول یہی ہے کہ قنوت نازلہ امام کو جہراً پڑھنا چاہئے، اسی کو اہل علم نے ترجیح دیا ہے۔ (دیکھئے اعلاء السنن ۶/۱۲۰) یوں دعاء آہستہ کرنا بھی درست ہے کیونکہ عام حالات میں آہستہ دعاء کرنا افضل ہے لہٰذا آہستہ دعاء کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

— جب امام قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر امام جہراً دعاء قنوت پڑھے تو مقتدی آمین کہنے پر اکتفاء کرے، اور اگر آہستہ قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی بھی دعاء کو دہرائے۔ (رد المحتار: ۲/۴۴۹)

— اس بات پر حنفیہ کا اتفاق ہے کہ جیسے نماز سے باہر ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاتی ہے، اس طرح قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی جائے گی، لیکن ہاتھ باندھ کر رکھا جائے؟ یا چھوڑ دیا جائے؟ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث موجود نہ ہونے کی وجہ سے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہاتھ باندھنا بہتر ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک ہاتھ چھوڑے رکھنا بہتر ہے۔ (دیکھئے اعلاء السنن: ۶/۱۲۲) چونکہ قنوت نازلہ "قومہ" کی حالت میں پڑھا جاتا ہے، اور قومہ کی حالت میں ہاتھ چھوڑے رکھنا مسنون ہے، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ چھوڑے رکھے، البتہ بعض شوافع اور حنابلہ کے نزدیک قنوت نازلہ میں بھی اسی

طرح ہاتھ اٹھانے کی گنجائش ہے، جس طرح عام دعاؤں میں ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں (فتاویٰ دار العلوم مع تحقیق ترمیم وغیرہ) مگر قنوت نازلہ کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے ثبوت میں کوئی حدیث نہیں۔

رہ گئے قنوت نازلہ کے الفاظ، تو اس سلسلے میں فقہاء نے الفاظ ہی کی پابندی ضروری نہیں: "وما دعاء بعینہ فیہ دعاء موقت" (البحر الرائق ۲/۴۴) البتہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت ہوں، ان کو پڑھنے کا اہتمام کرنا بہتر ہے، اس سلسلے میں ایک تو حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان الفاظ میں دعاء سکھائی:

"اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ
وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ وَقِنِي شَرَّ
مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ وَإِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ
وَالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ"

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۴۲۵)

اے اللہ! مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ ہدایت عطا فرمایئے جنہیں آپ نے ہدایت دی ہے، اور مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ عافیت میں رکھئے جن کو آپ نے عافیت سے سرفراز فرمایا ہے، اور میری بھی ان لوگوں کے ساتھ نگہداشت فرمایئے جن کو آپ نے اپنی نگہداشت میں رکھا ہے، جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت عطا فرمایئے، قضاء و قدر کے شر سے میری حفاظت فرمایئے، کیونکہ آپ فیصلہ کرتے ہیں، آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جسے آپ دوست بنائیں وہ ذلیل نہیں ہو سکتا، اور جس کے آپ دشمن ہوں، وہ با عزت نہیں ہو سکتا، پروردگار! آپ کی ذات بڑی بابرکت اور بلند ہے۔

حضرت عمرؓ کا بھی ایک دعا پڑھنا قول ہے جس کو امام بیہقیؒ نے بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (۲/۲۱۱ کتاب الوتر ۹) اور علامہ شامیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ابن ابی شیبہ کا حوالہ نقل کیا ہے جو وتر والی دعا قنوت پڑھنے کے بعد دعا پڑھا کرتے تھے، اس دعا میں حضرت عمرؓ کی دعا کا حصہ بھی آگیا ہے اس لئے اس دعا کے الفاظ کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"اللهم اغفر للمؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات وألّف بين قلوبهم وأصلح ذات بينهم وانصرهم على عدوك وعدوهم، اللهم العن كفرة أهل الكتاب الذين يكذبون رسلك ويقاتلون أولياءك، اللهم خالف بين كلمتهم وزلزل أقدامهم وأنزل بهم بأسك الذي لا ترده عن القوم المجرمين"

(ردالمحتار ۲/۴۴۳، ۴۴۴)

الٰہی! اے اللہ! ان مومن مردوں اور عورتوں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرمادیجئے، ان کے دلوں کو جوڑ دیجئے، ان کے باہمی اختلاف کو دور فرمادیجئے، ان کی آپ کے دشمن اور ان کے دشمن کے مقابل مدد فرمائیے، اے اللہ! کفار اہل کتاب پر آپ کی لعنت ہو جو آپ کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور آپ کے اولیاء سے برسرپیکار ہیں، اے اللہ! ان کے درمیان اختلاف پیدا کردیجئے، ان کے قدموں کو متزلزل فرمادیجئے، اور ان کو آپ اپنے اس عذاب میں مبتلا فرمائیے جو مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ دعا قنوت کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھی پڑھنا چاہئے "ويصلي على النبي ﷺ به يفتي" (الدرالمختار ۲/۴۴۳)

یہ وقت ہے کہ ہم مسلمان اپنی جبین بندگی خدا کے سامنے خم کردیں، اور پورے الحاح اور فروتنی کے ساتھ اللہ کے سامنے دست سوال پھیلائیں کہ دنیا میں اسلام کا نام سربلند ہو، اور اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والے یا تو خدا آخرت کی طرح دنیا میں بھی محرومی کا حصہ لے کر واپس ہوں۔ ''وما ذالک علی اللہ بعزیز، انہ علی کل شیئ قدیر''۔

(۱۹/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

سورج گہن ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

سورج، چاند، زمین، آسمان اور تمام سیارے جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کے وجود پر غور کیا جائے تو اللہ کی قدرت اور اس کی طاقت پر یقین بڑھتا ہے، اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اس زمین کے گرد سے جن سیاروں کا مشاہدہ کھلی آنکھوں کیا جا سکتا ہے، ان میں سورج سب سے بڑا بھی ہے، اور نظام کائنات میں اللہ کے حکم سے سب سے زیادہ اثر انداز بھی، ایک شعلہ جوالہ ہے، جو مسلسل اپنے محور پر چل رہا ہے، اور اپنی تپش سے کائنات کو زندگی کی حرارت بخشتا ہے۔ خدا کی شان ربوبیت دیکھئے کہ اتنے بڑے طاقتور اور شعلہ بار سیارہ کو بھی ایک دائرہ میں قید کر کے رکھا گیا ہے، جو انسانی زندگی کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، اگر وہ موجودہ مدار سے ہٹ کر زمین کے قریب آجائے تو پوری کائنات جل کر خاکستر ہو جائے، اور اگر اس کا زمین سے موجودہ فاصلہ اور بڑھ جائے تو پوری زمین برف سے ڈھک جائے، اور کسی جاندار کا زمین پر زندہ رہنا دوبھر ہو جائے، یہ اللہ کی قدرت ہے، کہ اس نے ہم انسانوں کے لئے ایک ایسا چراغ جلایا ہے، جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھتا ہے، لیکن کبھی اس کی لو بڑھ کر زمین میں آگ بھڑکاتی، انسان اس سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اسی لئے اسے اللہ کی ایک نشانی اور آیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے شرک کے غلبہ کی وجہ سے لوگوں پر توہمات کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لوگ ہر غیر معمولی واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور سے متعلق کئے ہوئے تھے، سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بڑے اور برگزیدہ آدمی کی پیدائش یا وفات پر یہ گہن لگا کرتا ہے۔ اتفاق کہ جس دن صاحبزادۂ رسول حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اسی دن سورج گہن تھا، اور لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید صاحبزادۂ رسول کی وفات

کی وجہ سے یہ سورج گہن لگا ہے، رسول اللہ ﷺ حالانکہ صاحبزادہ کی وفات کی وجہ سے بہت رنجیدہ خاطر اور دلگیر تھے، لیکن ایسے مواقع پر تنبیہ اور تعلیم کے اظہار کو آپ ﷺ ضروری سمجھتے تھے، اور بروقت اس جانب توجہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا، خطبہ کے درمیان آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گہن لگنے کا کوئی تعلق نہیں، جب تم گہن لگتے ہوئے دیکھو تو نماز کی طرف دوڑو!

(بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸)

یہ رسول اللہ ﷺ کا خاص طریقۂ تربیت تھا کہ جس وقت لوگ کسی مشرکانہ عقیدہ کی بنیاد بناتے، آپ ﷺ اسی کو اللہ کی وحدانیت کی طرف متوجہ کرنے اور عقیدۂ توحید کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنا لیتے، چنانچہ سورج گہن کے موقع پر آپ ﷺ نے جہاں لوگوں کی تفہیم فرمائی اور ایک جاہلانہ توہم پرستی کا ازالہ فرمایا، وہیں آپ ﷺ نے اس موقع سے دو رکعت نماز ادا کرنے کی سنت بھی جاری فرمائی، نماز اللہ تعالیٰ کی توحید کا عملی اظہار ہے، اور اس کے ایک ایک عمل سے اللہ سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہوتا ہے، جب نمازی نماز شروع کرتے ہوئے "اللہ اکبر" کہتا ہے تو وہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اللہ سے بڑائی کی نفی بھی کرتا ہے، سورۂ فاتحہ تمام تر توحید کا بیان اور شرک کی نفی و تردید ہے، غرض نماز کے ایک ایک جزء کی روح یہی ہے کہ خدا سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو۔

یہ کچھ اسی موقع کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احکامِ شریعت میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جس موقع پر لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تھے، اسلام نے اسی موقع کو توحید کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی دعوت کا ذریعہ بنایا، اسلام سے پہلے لوگ اچھے معاملات میں خیر و شر کو سمجھنے اور نفع و نقصان کا اندازہ کرنے کی غرض سے فال نکالا کرتے تھے، یہ فال بتوں کے سامنے نکالے جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ استخارہ کی نماز کا حکم فرمایا کہ جن امور کے بارے میں انسان کے دل میں تذبذب ہو اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے، وہ دو

رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو کہ اس کے لئے جس پر یہ عمل خیر ہو وہ شاید اس
کے دل میں ڈال دے۔ اسی طرح لوگ بتوں کے سامنے قربانی کیا کرتے تھے، آپ ﷺ
نے قربانی کو باقی رکھا لیکن بتوں اور شخصیت کی سمت تبدیل کر دی، کہ یہی عمل جو شرک کا
مظہر ہے توحید کا شعار بن جائے اور انسانی بندگی کے رنگ میں رنگ جائے۔ مسلمان دنیا
میں جہاں کہیں بھی ہوں ان کا یہی طرز طریق ہونا چاہئے کہ وہ خود مشرکانہ تصورات سے
متاثر ہونے کے بجائے ہر جگہ اسلامی فکر کو غالب کرنے اور معاشرہ کو توحید کے رنگ
میں رنگنے کی کوشش کریں، نہ یہ کہ ہم خود دوسری قوموں کی نقل کرنے لگیں۔

سورج گہن کو عربی زبان میں "کسوف" کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقع سے
حضرات صحابہ کو دو رکعت نماز پڑھائی، جس میں بہت طویل قرأت فرمائی، بعض روایتوں سے
معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران
کی تلاوت کی۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۱۸۷) جتنی طویل آپ ﷺ نے قرأت فرمائی، اتنا
ہی طویل رکوع فرمایا۔ (بخاری، حدیث نمبر ۱۰۵۲) حضرت اسماء کی روایت میں ہے کہ مجھ پر نماز
میں غشی سی طاری ہوئی، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے سر پر پانی ڈالا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر ۱۰۵۳)
حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع میں گئے تو ایسا لگتا
تھا کہ آپ ﷺ رکوع سے اٹھیں گے نہیں اور جب رکوع سے اٹھے تو ایسا لگتا تھا کہ گویا
کھڑے ہی رہیں گے، اسی طرح آپ ﷺ نے نماز کے تمام ارکان کو ادا فرمایا۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۱۹۴)

نماز میں آپ ﷺ پر اس قدر گریہ طاری تھا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ دوسری
رکعت کے آخری سجدہ میں آپ ﷺ کی سانس پھولنے لگی، آپ ﷺ روتے جاتے تھے۔
(نسائی، حدیث نمبر ۱۴۸۳) ایک روایت میں ہے کہ بے ساختہ زبان مبارک سے "اُف اُف"
نکل جاتا تھا، پھر آپ ﷺ خدا کے حضور عرض کناں ہوئے: میرے پروردگار! کیا آپ نے
مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ میں جب تک ان کے درمیان رہوں آپ انہیں عذاب نہیں
دیں گے؟ کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ لوگ استغفار کرتے رہیں۔

آپ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں فرمائیں گے؟۔ (ابوداؤد، حدیث ۱۱۹۳) غرض ایک گھبراہٹ اور اضطراب کی کیفیت آپ ﷺ پر طاری تھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی جب تک سورج اچھی طرح کھل نہیں گیا، آپ ﷺ قبلہ رخ دعاؤں میں مشغول رہے۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۱۹۴)

سورج گہن کے موقع سے آپ ﷺ نے دعا، تکبیر اور صدقہ کرنے کی بھی تلقین فرمائی: "فاذا رأيتم ذالك فادعوا الله وكبروا وصلوا وتصدقوا" (بخاری، باب الصدقۃ فی الکسوف) اسی موقعہ سے آپ ﷺ کو جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی دردناک سزاؤں کی جھلکیاں بھی دکھائی گئیں، جنت کا خوشگوار نظارہ ایسا تھا کہ بے ساختہ آپ ﷺ کے قدم آگے بڑھ جاتے، اور دوزخ کی ہیبت ناکیاں ایسی تھیں کہ قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ (بخاری عن عبداللہ بن عباس، باب صلاۃ الکسوف جماعۃ) اسی لئے آپ ﷺ نے خاص طور پر اس موقع سے صحابہ کو اس جانب متوجہ فرمایا کہ وہ عذاب قبر سے حفاظت کی دعا کریں: "ثم امرهم ان يتعوذوا من عذاب القبر" ۔ (بخاری، باب التعوذ من عذاب القبر) ۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ سورج جیسا روشن سیارہ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی کی بھیک حاصل کرتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ اس دنیا سے آج وہ تاریک نظر آرہا ہے، یہ اس لئے کہ چاند سورج اور زمین کے درمیان چند لمحوں کے لئے حائل ہوگیا ہے، جو معمول کے خلاف ہے، اگر اللہ تعالی سیاروں کی گردش کے نظام میں ایسی تبدیلی فرمادے کہ مسلسل یہ کیفیت برقرار رہے تو زمین کے لئے روشنی کا حصول کس قدر دشوار ہو جائے؟ پھر اگر سورج اپنے مدار سے ہٹ جائے، زمین سے قریب آجائے اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ لے تو شاید وہی لمحہ قیام قیامت کا ہوگا، لیکن یہ رحمت خداوندی ہے کہ کائنات کے مختلف سیاروں میں ایسی قوت کشش رکھی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس وسیع و عریض فضا میں، سورج گہن یا چاند گہن کا واقعہ قیامت کی، قبر کی، اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن سے متعلق بعض خیالات و تصورات جو عوام میں گردش کرتے رہتے ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ہاں میڈیکل اعتبار سے انسان کی

جاتی یا یہ حمل جنین پر گہن کا اثر پڑتا ہو تو ایسا ممکن ہے، وہ اس سلسلہ میں ڈاکٹرس اور فنی ماہرین ہی صحیح نقطۂ نظر پیش کر سکتے ہیں، لیکن عوام میں جو یہ بات چل پڑی ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے سورج گہن کے درمیان حاملہ عورتوں کے لئے کچھ خصوصی احکام ہیں، یہ صحیح نہیں، اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بس اسی قدر ہے کہ اس موقع کو کھیل تماشہ اور لہو ولعب کا سامان بنانے کے بجائے عبرت و موعظت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنایا جائے، اور یہ واقعہ ایمان کی تجدید، یقین میں اضافہ، آخرت کے استحضار اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ اور محرک ہے، یہی اس عظیم کائناتی واقعہ کا پیغام اور اس کی دعوت ہے۔

(۳ اگست ۱۹۹۹ء)

شہاب ثاقب ۔۔۔۔ اسلامی نقطۂ نظر

۱۷، ۱۸ نومبر ۱۹۹۹ء کی شب قدرت کی آتش بازی کی شب تھی۔ اس رات آسمان سے شہاب ثاقب کی ایسی خوبصورت بارش ہوئی کہ ایک طرف آنکھیں اس کی دید کے لئے مشتاق تھیں اور دوسری طرف سائنس داں فکرمند و پراہتمام تھے کہ کہیں ان شوخ انداز پری پیکر شہابیوں کے قدم تا خلا میں جانے والے مصنوعی کرّوں (سیاروں) کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ یہ شہاب ثاقب پانچ ہزار فی گھنٹہ کی تعداد میں زمین کی طرف لپک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ۱۸۳۳ء اور ۱۹۶۶ء میں بھی لوگوں کو یہ خوشگوار منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں شہاب ثاقب کی بارش کا یہ منظر ایک مؤرخ کے سامنے آیا، ذہن پر اس قدر چھایا کہ اس نے اسے امریکہ کی تاریخ کے سو یادگار واقعات میں شمار کیا۔ اس قدرتی فلکیاتی واقعہ نے مختلف اخبارات اور جرائد میں کلیدی اہمیت حاصل کرلی اور فکر و نظر کا موضوع بنا رہا۔ اس کے فوائد اور نقصانات پر گفتگو ہوتی رہی اور امکانی خطرات اور اندیشے غور و فکر کا محور بنے رہے۔ آئیے اس مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ کوئی بھی واقعہ پیش آئے تو ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی پہلو سے اس پر غور کرے اور اس کو اپنے لئے عبرت و موعظت کا، ایمان میں اضافہ کا، اور انابت و اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

قرآن نے خدا کو صرف زمین ہی کا رب قرار نہیں دیا ہے بلکہ خدا کو "رب العالمین" کہا ہے، یعنی پوری کائنات اور تمام عالموں کا رب۔ اس لئے اس دنیا کی فضا میں جو بے شمار بڑے چھوٹے گرم اور ٹھنڈے، حیات کے لائق اور اس کے لئے غیر موزوں جتنے سیارے ہیں، وہ سب ایک نظام سے مربوط ہیں اور خدا کے حکم کے تابع ہیں۔

''زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط دس کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے، ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے، بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے، چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے''۔

(تفہیم القرآن: ۲؍۵۰۱)

یہ تو شہاب ثاقب کے سلسلہ میں وہ فضائی حقائق ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس '' نظر آنے والی حقیقت '' کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک اَن دیکھی '' غیبی حقیقت '' کو بھی متعلق کر دیا ہے، جسے انسان نہیں دیکھ سکتا اور وہ یہ کہ عالم بالا پر اللہ تعالیٰ کے جن فیصلوں کا اعلان فرشتوں کے درمیان کیا جاتا ہے، شیاطین ان کو سننے اور جاننے کے لئے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، شہاب ثاقب کی یہ بارش ان کو اس سے روکتی ہے اور آسمان تک رسائی سے محروم رکھتی ہے۔ قرآن نے کئی مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے۔ (الحجر: ۱۸، الملک: ۵)

بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں خلاف عقل معلوم ہوتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قانون فطرت کے تابع ہے، شیطان کے بھگانے اور اس کے مترا۔ بالائی کو روکنے سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں، ایک ہی واقعہ کا ایک ظاہری سبب ہو سکتا ہے، جو نگاہ کے احاطہ میں ہو، اور ایک چھپا ہوا سبب، جسے دکھانہ جا سکے، انسان دیکھے سبب تک

جنہیں اور اس کو ماننے کا نام "ایمان بالغیب" ہے۔ انسان اپنے وجود ہی پر غور کرے، بظاہر انسان کا وجود ایک مرد اور ایک عورت کے ملاپ کا نتیجہ ہے، لیکن کیا روح و زندگی کے پیدا ہونے کے لئے بھی کافی ہے؟ کیا یہ بات انسان کی قدرت میں ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کسی زندہ انسان کو وجود بخشے؟ اور کیا انسان کو یہ جنسی عمل ہمیشہ ہی تولید کا ذریعہ بنتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب "نفی" میں ہے۔ جنسی تعلق ایک ظاہری سبب ہے، لیکن اس کے پیچھے "حکمِ خداوندی" کا حقیقی سبب کارفرما ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے جو انسان کے وجود کا سبب بنتا ہے، ورنہ کوئی جوڑا لاولد نہیں ہوتا اور ہر ماں باپ کے کتنے ہی بال بچے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے انسان کے امتحان کے لئے بہت سی حقیقتوں کو چھپا رکھا ہے۔ تاکہ اس بات کی آزمائش ہو سکے کہ انسان ان دیکھی حقیقتوں پر بھی یقین کرنے کو تیار ہے! اللہ تعالیٰ انسانوں کی سرزنش اور تنبیہ کے لئے بارش روک دیتے ہیں اور کبھی حد سے زیادہ بارش بھیجتے ہیں، سیلاب بلاخیز، علاقے کے علاقے کو تباہ و تاراج کر دیتا ہے، طوفان اور زلزلہ کا عذاب آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب یہ بھی ہے کہ کوئی قوم باہمی افتراق میں مبتلا ہو اور ان کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ جائیں، یہ سب خدا کی طرف سے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات ہیں، لیکن ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب سے متعلق کر دیا ہے، تاکہ خدا جن باتوں کو ان دیکھے منوانا چاہتا ہے وہ بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں۔ آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جس میں یہ تمام حقیقتیں بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں گی، فرشتے ان کی نگاہوں میں ہوں گے، جنت و دوزخ کو وہ اپنے سر کی آنکھوں دیکھے گا، صالحین تجلی ربانی کو اپنا سرِ چشم پائیں گے، اس دن ان حقیقتوں پر ایمان لانے کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ایک دیکھی ہوئی حقیقت کا اقرار ہوگا۔ غرض شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کا ایک ظاہری سبب ہے جو انسانی عقل کی گرفت میں آچکا ہے اور ایک غیبی سبب ہے جس کو انسان کی عقل نارسا دریافت نہیں کر سکتی اور جس کا

علم ہمیں خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے ہوتا ہے۔ یہ بات نہ خلافِ عقل ہے اور نہ خلافِ فطرت۔

ایسے غیر معمولی کائناتی واقعات پیش آنے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا کائنات محض ایک تماشہ گاہ ہے اور ہم اس کے تماشائی ہیں؟ یا ایسے واقعہ کے لئے کوئی اسوۂ نبوی بھی موجود ہے؟ .. یقیناً موجود ہے! آپ نے سورج گہن کے موقع سے نماز ادا کی ہے، کیوں کہ یہ ایک غیر معمولی کائناتی واقعہ ہے، چاند گہن کے موقع سے بھی آپ ﷺ نے نماز پڑھنے کی ہدایت دی ہے۔ (بخاری: ۱۰۴۰) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے زلزلہ کے موقع سے نماز ادا فرمائی۔ (سنن بیہقی ۳/۳۴۳) اسی لئے فقہاء حنفیہ اور شوافع نے زلزلہ، مسلسل بجلی کی چمک، تیز ہوا، دن کے وقت تاریکی، رات کے وقت غیر معمولی روشنی، مسلسل بارش اور برف باری، وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے اور اس طرح کی آفتوں کے موقع پر تنہا تنہا دو رکعت نماز ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ (مراقی الفلاح ۲۹۰، بدائع الصنائع ۱/۲۸۲، شرح مہذب ۵/۵۵) اور زلزلہ میں تو فقہاء حنابلہ نے بھی اس طرح نماز پڑھنے کو مستحب کہا ہے۔ (کشاف القناع ۲/۶۷، المغنی ۲/۳۳۲) اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اس طرح گھبراہٹ والی چیز دیکھو تو دعاء کے ذریعہ اللہ کی طرف متوجہ ہو اور بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ کا ذکر اور استغفار کرو۔

(نصب الرایہ ۲/۲۳۳)

ظاہر ہے کہ معمول سے بڑھ کر شہاب ثاقب کی بارش کا واقعہ یقیناً گھبرا دینے والا واقعہ ہے، کیوں کہ اگر یہ شہاب ثاقب اپنے اصل حجم میں زمین پر آ پہنچیں اور فضا سے گزر کر زمین پر یہ بارش ہونے لگے تو شاید ہی کائنات کی کوئی چیز بچ سکے اور اگر وہ ان مصنوعی سیاروں ہی کو تباہ کر دے جن کو انسان نے فضا میں بھیجا تو بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ ہوگا، جو لوگ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں، مواصلات اور ابلاغ کے جدید ذرائع پر جن کا کاروبار اور بہت سی بنیادی ضروریات موقوف ہیں، ان کے لئے یہ حادثہ

زندگی کو کتنا بے لطف کر کے رکھ دے گا۔

اس لئے ایسے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل نماز عام نمازوں کی طرح ادا کی جائے، نماز تنہا ادا کی جائے نہ کہ جماعت سے، دعا ہوئی جائی کہ خداوند!! اس واقعہ کے شر سے ہماری اور پوری انسانیت کی حفاظت فرمائیے۔

(۲۷ نومبر ۱۹۹۸ء)